

خوابوں کے عذاب



علیم الحق حق

خوابوں کے عذاب

خواب ہر کوئی دیکھتا ہے۔ خواب رنگین بھی ہوتے ہیں اور سنگین بھی۔ خوابوں کی دنیا بڑی حسین اور دلفریب ہوتی ہے لیکن جب یہی خواب اپنا رنگ و روپ بدل کر ڈرائے لگیں تو زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ ایک حساس اور تخیل پسند تخلیق کار کا قصہ اس کے حسین خوابوں کا رنگ بھی اچانک بدل گیا تھا اور اس کی ہنستی کھیلتی زندگی میں زہر گھل گیا تھا۔

اطلاعی تھنی بجے جارہی تھی، جیسے کوئی گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ کر بھول گیا ہو۔ چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج سے ہوتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے دروازے کی درمیان والی چٹنی کو کھینچا پھر اوپر والی چٹنی گرائی۔ اسی لمحے دروازہ پوری طاقت سے دھکیلا گیا۔ لڑکا سنبھل نہیں سکا۔ وہ نیچے گرا اور خوف زدہ نظروں سے اندر گھس آنے والوں کو دیکھتا رہا۔

اندر گھسنے والوں کی تعداد پانچ تھی۔ سب سے پیچھے والے نے دروازہ بند کر کے چٹنیاں اوپر چڑھا دیں۔ نیچے گرا ہوا لڑکا سکتے کی سی حالت میں انہیں دیکھ جا رہا تھا۔ وہ پانچوں جوان تھے۔ عمریں بائیس اور تیس کے درمیان ہوں گی۔ وہ یقیناً خوش شکل بھی ہوں گے لیکن اس وقت تو ان کے پسینوں سے نہائے ہوئے چہروں سے وحشت اور درشتی ٹپک رہی تھی۔ آنکھوں میں سختی تھی۔

”اٹھو۔ کیا یونہی پڑے رہو گے؟“ مداخلت کاروں میں سے ایک نے کہا۔ انداز سے وہ سرغنہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ لڑکے سے مخاطب تھا۔

لڑکا بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹ لرزے لیکن کوئی آواز نہیں نکلی۔

”گھر میں اور کون کون ہے؟“ سرغنہ نے پوچھا۔

لڑکا اب بھی کچھ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ بدستور لرز رہے تھے۔ تاہم اس کی شکل اسی دروازے سے آنے والی خاتون نے حل کر دی، جس سے وہ خود نکل کر آیا تھا۔ خاتون کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ وہ بہت خوش پوش اور باوقار تھیں۔

”نعمان..... کون آیا.....“ وہ کمرے سے کہتی ہوئی نکلیں لیکن وہ منظر دیکھ کر

ان کی آواز بند ہو گئی۔

سرغنہ نے ان کی آواز سنی تھی یا آہٹ۔ بہر حال اس نے ان کی آمد کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس نے جلدی سے ریوالمور نکالا اور اسی سمت جھپٹا تھا۔ خاتون پہلے گنگ ہوئی تھیں اور پھر چیخنے ہی والی تھیں کہ سرغنہ نے ریوالمور لہراتے ہوئے کہا۔ ”چیخنے کی حماقت مت

کرتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو کوئی نقصان پہنچے۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

خاتون کا ہاتھ اپنے منہ پر جم گیا۔ انہوں نے پرتشویش نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھا جو فرش پر گرا ہوا تھا۔ سرغنہ نے ان کی پریشانی بھانپ لی۔ ”اس کی فکر نہ کریں۔ وہ خیریت سے ہے۔ بس دھکے سے گر گیا تھا۔“ اس نے نسبتاً نرم لہجے میں انہیں دلاسا دیا پھر بولا۔ ”گھر میں جتنے لوگ بھی ہیں، سب کو آواز دے کر بلا لیجئے۔ نہیں..... آپ یہاں سے نہیں ملیں گی۔ میں پھر دہرا دوں کہ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سے تعاون کیا جائے۔“

خاتون نے لرزتی آواز میں پکارا۔ ”سین..... یہاں آئیں۔ بچوں کو بھی لے آئیں۔“

ذرا دیر بعد پوری فیملی ٹی وی لائونج میں موجود تھی۔ گرا ہوا لڑکا بھی اٹھ کر سب کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ تین بہن بھائی اور تھے۔ گھرانے کے سربراہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

”میری بات سنو۔ ہمارے پاس بہت کچھ نہیں ملے گا تمہیں.....“

”خاموش رہیں۔ ہم خود اپنے مطلب کی چیز تلاش کر لیں گے۔“ سرغنہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اب سب لوگ ڈرائنگ روم میں چلیں۔“

وہ سب ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ پوری فیملی ایک صوفہ سیٹ میں سما گئی۔ وہ سب ایک دوسرے سے قریب ہونے..... لپٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”بیٹے..... تمہارا جوجی چاہے لے جاؤ لیکن ہمارے ساتھ کچھ نہ کرنا۔“ خاتون نے التجائی۔

سرغنہ چند لمحے خاتون کو خشکیں نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ”فرق ہے آپ کے ہاں؟“

”ہاں..... کچن میں ہے۔“

سرغنہ نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ سرغنہ مضطربانہ انداز میں ریوالور لہراتا رہا۔ اس کے ساتھی بہت نروس نظر آ رہے تھے۔ دوسری طرف فیملی کا بہت برا حال تھا۔ ان سبوں کے جسموں پر لرزہ طاری تھا۔

چند لمحے ہوئے ہوں گے کہ جو لڑکا باہر گیا تھا، وہ ڈرائنگ روم میں واپس آ گیا۔ اس

بار اس کے چہرے پر تازگی تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ اس کے ہاتھوں میں ایک نرے تھی جس پر پانچ گلاس اور وٹو کولا کی ڈیزھ لیٹر والی بوتل رکھی تھی۔ اس نے نرے میز پر رکھی اور بوتل سے گلاس بھر دیئے۔ ایک گلاس اس نے سرغنہ کو دیا۔ ”یہ لو باس۔“ پھر ایک گلاس اس نے اپنے لیے اٹھایا اور اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”اپنی مدد آپ۔“

وہ پانچویں یوں پی رہے تھے، جیسے دن بھر کے پیاسے ہوں۔ متاثرہ فیملی انہیں خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ان لوگوں نے گلاسوں میں دوبارہ مشروب لیا۔ اب وہ بہت پرسکون نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات یکسر بدل چکے تھے۔ درشتی کی جگہ نرمی نے لے لی تھی۔ آنکھوں میں طمانیت تھی۔

”تم لوگ جو چاہو لے جاؤ لیکن میرے بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“ خاتون نے التجائی۔

اس بار سرغنہ مسکرایا۔ ”سوری..... ہم لوگوں نے آپ کو بہت تکلیف دی لیکن جو کچھ ہمیں چاہیے تھا، وہ ہم لے چکے ہیں۔“

صاحب خانہ اور خاتون خانہ کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

”کک..... کیا مطلب؟“ انہوں نے بیک آواز کہا۔

”ڈم..... م م..... ٹو..... دو..... کو وولا آآ۔“ پانچوں مداخلت کاروں نے بھی بیک آواز گنگتاتے ہوئے کہا۔

گھر کے تمام افراد کی آنکھیں یوں چمکیں، جیسے بات ان کی سمجھ میں آگئی ہو پھر صاحب خانہ نے الجھن بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”لیکن وٹو کولا تمہیں نیچے سٹور سے بھی مل سکتا تھا۔“

”جی نہیں۔ آپ بھول رہے ہیں کہ آج پیہہ جام ہے۔“ سرغنہ بولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پانچوں ڈرائنگ روم سے نکل گئے۔ دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی پھر بچوں نے کہا۔ ”ہم بھی وٹو کولا پیئیں گے۔“

صاحب خانہ نے اپنی پریشانی پر ہاتھ پھیر کر ہینہ پونچھا اور بڑے بیٹے سے بولے۔

”نعمان..... دیکھو فرق میں ایک اور بوتل ہوگی۔“

بڑا بیٹا اٹھ کر لپکا پھر اسکرین پر ماں باپ اور بچے وٹو کولا پیتے ہوئے ساکت ہو گئے۔ ساتھ ہی اسکرین پر الفاظ اور پس منظر سے آواز ابھری۔ ”جوائس آف ٹین ایجز اپ

لونا نئی! اور اسکرین پر اندھیرا چھا گیا۔
 ”وڈر فل۔“ وڈو کولا بنانے والی کمپنی کے ڈائریکٹر نے بلند آواز میں کہا۔ ”مجھے یہ
 کمرشل بہت اچھا لگا ہے۔ اب ٹی وی پر بھی چلوایے۔“
 ایڈورٹائزنگ کمپنی کے ایگزیکٹو نے اطمینان کی سانس لی۔
 ”ٹھیک ہے مشدی صاحب۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ آپ کو پسند آیا۔“
 ”یہ کام کس کا ہے؟“ وڈو کولا کے ڈائریکٹر نے پوچھا۔
 ”ایک جوان آدمی ہے عمران ایاز۔ اسے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے ہمارے ہاں۔“
 ”میرا مشورہ مانیں تو اسے ہاتھ سے نہ نکلنے دیجئے گا۔ ہی از ویری امیجی نیٹو۔ کس
 لائیک ہی از فل آف فریش آئیڈیاز۔“
 ”ہی از اور سیٹ سر۔“ ایگزیکٹو کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ ابھری۔ ”آپ
 جانتے ہیں، ہم ٹیلنٹ ضائع نہیں ہونے دیتے۔“
 ”میں خوب جانتا ہوں۔“ ڈائریکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن اکاؤنٹ ایسے ہی
 لوگوں کے دم سے قائم رہتے ہیں۔“
 ”رائٹ سر۔ آئی ایگری وڈہ یو۔“

☆=====☆=====☆

الفا ایڈورٹائزنگ کا ڈائریکٹر سعید بخاری گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ پریشان نہیں
 تھا۔ بلکہ مطمئن تھا لیکن اسے کوئی بڑا فیصلہ کرنا تھا۔ اب یہ ناگزیر معلوم ہو رہا تھا۔ گزشتہ
 چند ماہ میں تشبیر کا کام ارتقا کا متقاضی معلوم ہونے لگا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ایڈورٹائزنگ کا
 شعبہ وسعت اختیار کر رہا تھا۔ اس کاروبار میں کامیابی کے امکانات بہت زیادہ تھے اور ان
 میں مسلسل اضافے کا امکان تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ ایڈورٹائزنگ کی ٹیکنیک بھی دنیا
 بھر میں آگے..... بہت آگے چلی گئی تھی۔ گھسے پئے انداز میں پہلنی کرنے کا وقت ختم
 ہو چکا تھا۔ بڑے اکاؤنٹ بہت زیادہ ڈیمانڈنگ ہو گئے تھے۔ اب ان کی تسلی اس سے نہیں
 ہوتی تھی کہ باہر کے کمرشلز کو اپنے ماحول میں اڈاپٹ کر لیا جائے۔ اب وہ اور پینل اپروچ
 کا تقاضہ کر رہے تھے۔

سعید بخاری جانتا تھا کہ اپنے ملک میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں لیکن اسے تلاش کرنا
 آسان نہیں تھا۔ اس کی نسبت یہ زیادہ آسان تھا کہ جو لوگ بھی میسر ہیں، انہیں گرومنگ

کے لیے بیرون ملک تربیتی کورس میں بھیجا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک جامع
 پروگرام بنالیا تھا۔ اب بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں اسے پیش کرنا تھا۔ اس میٹنگ
 میں وہ ایک نوجوان کے مستقبل کا مسئلہ بھی اٹھانا چاہتا تھا۔
 کام کے ڈیمانڈنگ ہونے کا مسئلہ تین ماہ پہلے سامنے آیا تھا۔ وڈو کولا کے مشدی
 صاحب نے وڈو کولا کے انداز میں بتادیا تھا کہ اگر روایتی ایڈورٹائزنگ جاری رہی اور کوئی نئی
 اپروچ نہیں دکھائی دی تو الفا ایڈورٹائزنگ سے یہ اکاؤنٹ چھن جائے گا۔ وہ پہلا موقع تھا
 کہ کمپنی کے سامنے کوئی چیلنج آیا تھا۔ الفا ایڈورٹائزنگ کو یہ علم بھی نہیں تھا کہ اس کے
 پاس اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے وسائل بھی ہیں یا نہیں۔ جن چار نوجوانوں کو یہ چیلنج
 سونپا گیا تھا، عمران ایاز ان میں سب سے جونیئر تھا لیکن جب کام سامنے آیا تو وہ باقی تینوں
 سے میلوں آگے کھڑا نظر آیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے تین لڑکے مختلف اپروچ دکھائی
 نہیں سکے تھے۔

سعید بخاری کچھ لڑکوں کو ایڈورٹائزنگ کے تربیتی کورس کے لیے باہر بھجوانا چاہتا
 تھا۔ اس کے خیال میں عمران ایاز کو کسی کورس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس میں جو
 صلاحیت تھی، وہ پیدا نشی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ صلاحیت دریافت بھی کرلی
 گئی تھی۔ مشدی صاحب نے مشورہ دیا تھا کہ اسے ہاتھ سے نہ نکلنے دیا جائے اور ان کا
 مشورہ صائب بھی تھا۔ ضروری تھا کہ عمران ایاز کو اہم مقام دیا جائے۔ یعنی غیر معمولی
 ترقی..... عمدے میں بھی اور تنخواہ میں بھی۔

سعید بخاری بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں یہ مسئلہ اٹھانا چاہتا تھا لیکن اس کے
 خیال میں صرف ایک کمرشل کی بنیاد پر یہ سفارش نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کی صورت یہ
 تھی کہ عمران ایاز کو کوئی اور کام سونپا جائے۔ دوبارہ بھی اس نے ایسی ہی کارکردگی دکھائی تو
 وہ اس کا کیس زیادہ مضبوطی سے پیش کر سکے گا اور کام کی تو کمی ہی نہیں۔ وہ وقت
 آنے والا ہے کہ ہر کلائنٹ فریش اپروچ کا مطالبہ کرے گا۔ بہتر ہے کہ اس کے لیے پہلے
 ہی سے خود کو تیار کر لیا جائے۔

اس نے انٹرکوم پر سیکریٹری کو ہدایت دی کہ عمران ایاز کو بلوائے۔

☆=====☆=====☆

عمران ایاز کمپنی کے ڈائریکٹر سعید بخاری کے کمرے سے لونا تو بہت خوش تھا۔ یہ

امید تو اسے پہلے سے تھی کہ اس کا وٹو کولا والا کام سراہا جائے گا لیکن یہ اندازہ اسے نہیں تھا کہ اتنا سراہا جائے گا۔ بخاری صاحب نے جس انداز میں اس کی تعریف کی تھی، اس نے خود کو فضا میں اڑتا محسوس کیا تھا۔ یہی نہیں، بخاری صاحب نے اسے ایک اور کام بھی سونپا تھا۔

”عمران..... میں تمہیں ایک اور کام سونپ رہا ہوں۔“ بخاری صاحب نے کہا تھا۔ ”تمہیں دھنک لان کی پیلٹی کے لیے پلاننگ کرنی ہے۔ تمہارا وٹو کولا والا کام جتنا پسند کیا گیا ہے، اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

”تھینک یو سر۔“ عمران نے انکساری سے کہا۔ ”اس نئے کام کے لیے کوئی خاص ہدایت؟“

”صرف یہ کہ روایت سے ہٹ کر ذرا جدت سے کام لینا ہو گا۔ وہی فریش اپروچ والا معاملہ ہے۔ اور ایک بات بتادوں۔ ذہن میں رکھنا۔“

”لیس سر؟“

”یہ تمہارا آزمائشی کام ہے۔ اگر تم نے وٹو کولا والا معیار برقرار رکھا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے ہاں تمہارا مستقبل بے حد درخشاں ہے۔ اس وقت تمہیں یہاں کیا مل رہا ہے؟“

”چھ ہزار سر۔“

بخاری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ چند لمحے بعد بولے۔ ”یہ کام اچھا کر دکھاؤ تو بہت آگے سے اشارت لو گے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس کا جو انعام ملے گا، وہ تمہاری توقع سے بہت زیادہ ہو گا۔ بس اب تم جاؤ اور اس لان کے کمرشل پر کام شروع کر دو۔“

سو عمران ایاز بہت خوش تھا لیکن خوشی اپنے ساتھ اداسی بھی لاتی ہے۔ اس خوشی کے موقع پر اسے زہرہ یاد آگئی۔ وہ اداس ہو گیا۔ دفتر میں اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے وہ زہرہ کی یادوں میں کھو گیا۔

زہرہ اس کی پہلی محبت تھی۔ وہ اسے بے حد چاہتا تھا۔ اس سے ملاقات کالج میں ہوئی تھی۔ بعد میں بھی وہ ملتے رہے تھے۔ عمران تو باقاعدہ اس کی محبت میں گرفتار تھا۔ یہ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ زہرہ بھی اس سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔

زہرہ میں آگے بڑھنے، اوپر جانے کی لگن بہت طاقتور تھی..... خوف ناک حد تک طاقتور، یہ اندازہ تو عمران کو بہت بعد میں ہوا کہ اس کے ساتھ وہ بس وقت گزاری کر رہی تھی۔

عمران کو اس سے آخری ملاقات اور اپنا شک اب تک یاد تھا۔

”میری شادی ہو رہی ہے۔“ زہرہ نے یوں کہا جیسے شاپنگ کے لیے جانے کے متعلق بات کر رہی ہو۔

عمران نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ مذاق کر رہی ہے لیکن اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔

”تم سیریس ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”شادی تو ہوتی ہی سیریس معاملہ ہے۔“

”کون ہے وہ خوش نصیب.....؟“

”ایک مل اونر کا بیٹا۔“

”اور تم کر لوگی یہ شادی؟“ عمران کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”میں اپنے جیلے میں ایک ترمیم کر لوں۔ وہ ایک مل اونر کا اکلوتا بیٹا ہے۔“

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”میرا ترمیم شدہ جملہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔“ زہرہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں ایسے رشتے کو کیسے ٹھکرا سکتی ہوں۔“

وہ عمران کے لیے شاکلگ لمحہ تھا۔ ”میرا خیال تھا کہ.....“

”میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہی نا؟“ زہرہ نے حتمیت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہی تو بیک ورڈ لوگوں میں خرابی ہوتی ہے۔ محبت کو لازمی مضمون سمجھ کر جزو تعلیم بنالیتے ہیں اور محبت کے نام پر خود غرضی کی حد کر دیتے ہیں۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“ عمران نے تند لہجے میں پوچھا۔

”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ لوگ محبت کے نام پر محبوب کے پیروں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں کہ وہ اوپر نہ جاسکیں اور یہ وہی لوگ کرتے ہیں جو خود پرواز کا حوصلہ رکھتے ہیں

نہ استطاعت۔

”تم میری توہین کر رہی ہو زہرہ۔“

”نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ زہرہ نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ ”بات صرف اتنی سی ہے کہ میں حقیقت پسند ہوں۔ میں بس تمہیں آئینہ دکھا رہی ہوں۔ تم بہت اچھے انسان ہو۔ ذہین بھی ہو۔ تخیل تمہارا بہت زرخیز ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ تم بے حد تخیلاتی ہو لیکن یہ کوئی خوبی نہیں۔ یہ تمہیں بے عمل بناتی ہے۔ ذرا سوچو کہ تم زندگی میں کیا کر سکتے ہو۔ بس یہ ٹکری ہی کرتے رہو گے اور کلرک کی زندگی کوئی زندگی ہوتی ہے۔“ اس کے لہجے میں حقارت آگئی۔

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں ہمیشہ کلرک نہیں رہوں گا۔“ عمران نے تند لہجے میں کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ تخیل کے زور پر تم کسی ملک کے بادشاہ بھی بن سکتے ہو۔“ زہرہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ورنہ شاعر تو بن ہی جاؤ گے۔ شاعر بھوکا سہی، بادشاہ ہی ہوتا ہے۔“

عمران اس توہین کو زہرہ کے گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔ ”خیر..... آنے والا وقت بتائے گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”بلکہ اپنی اس خوش فہمی پر میں پشیمں ہوں کہ میرے خیال میں تمہیں مجھ سے.....“

”ہم بس اچھے دوست تھے۔“ زہرہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

”یہاں بھی تم غلطی پر ہو۔ دوسروں کے پروں کے زور پر اونچا اڑنے کی خواہش رکھنے والوں کی زمین پر چلنے والوں سے دوستی کبھی نہیں ہوتی۔“ عمران نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی مرد اور عورت کے درمیان دوستی کا تصور محض خود فریبی ہے۔“

”بہت تلخ ہو رہے ہو۔“ زہرہ نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن یہ سچ ہے کہ ہم اچھے دوست ہیں اور رہیں گے۔ میں تم سے ملتی رہوں گی۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں۔“ عمران نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس آخری ملاقات کے اگلے ہی دن اسے الفا ایڈورٹائزنگ میں انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا۔ اپائنٹ منٹ لیٹر بھی مل گیا۔ کیوں نہ ملے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار اس نے سفارش استعمال کی تھی۔ بس اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ اس کام کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کی قوت متخیلہ یہاں کام آئے

گی۔ اسے یقین تھا کہ تقدیر نے کوئی موقع دیا تو اس فیلڈ میں وہ بہت آگے جاسکتا ہے۔ اور اب ایک سال سے ذرا ہی زیادہ ہوا تھا کہ اس کی بات درست ثابت ہو گئی۔ بخاری صاحب نے لفظ بہ لفظ یہی بات کہی تھی اس سے۔ ایک بے عمل آدمی کے لیے تو چھ ہزار تنخواہ ہی کم نہیں۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ جب کہ بخاری صاحب کہہ رہے تھے کہ ایک اور کامیاب کمرشل کے بعد وہ اس سے بہت آگے سے اشارت لے گا۔ کاش..... کاش وہ زہرہ کو جا کر بتا سکتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ چھ ماہ قبل مل اونز کے اکلوتے بیٹے سے زہرہ کی شادی ہو چکی تھی۔

اس نے سر جھٹکا، جیسے زہرہ کو پرے دھکیلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ اس نے جھنجھلا کر سوچا۔ زہرہ کی یاد سے میں پیچھا کیوں نہیں چھڑا سکتا۔ ہر موقع پر وہ کیوں یاد آتی ہے مجھے۔ جب کہ سچ پوچھو تو اس سے قطع تعلق میرے لیے مبارک ہی ثابت ہوا۔ اگلے ہی روز تو مجھے یہ جاب ملی تھی۔

اس نے زہرہ کے خیال کو ذہن سے دھکیلا اور لان کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ کام بہت اچھا تھا۔ اسے بہت زیادہ اہمیت دیتا تھی۔

☆=====☆=====☆

ثمینہ اوپر اپنے کمرے میں تھی کہ اس نے نیچے شہلا کی آواز سنی۔ وہ اس کی امی سے باتیں کر رہی تھی۔ ثمینہ کو اندازہ تھا کہ ابھی شہلا کو اوپر آنے میں کچھ دیر لگے گی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ امی شہلا سے کیا باتیں کر رہی ہوں گی۔ اب شہلا کے ذریعے اس پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ اس نے گہری سانس لی اور صوفے پر ٹنگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد شہلا اوپر آگئی۔ ثمینہ نے اٹھ کر اسے پلٹا لیا۔ ”نیچے سے اوپر تک آنے میں بہت دیر لگی تمہیں؟“ اس نے شکایتاً کہا۔

”تم نے چکر ہی ایسے چلا رکھے ہیں۔“ شہلا نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

”چھوڑو ان باتوں کو۔“ ثمینہ نے بے پروائی سے کہا۔ ”اور سناؤ۔ تم کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تم اپنی کمو۔“

شہلا نے اسے سر تپا غور سے دیکھا۔ ”تم تو ٹھیک لگ رہی ہو لیکن آنٹی بہت پریشان ہیں۔“

”بلا وجہ پریشان ہیں۔“ ثمینہ جھنجھلا گئی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پریشانی کی کیا

” بات ہے۔“

”پریشانی کی بات تو ہے۔ رشتوں کے معاملے میں لڑکیاں ایسی شرطیں تو عائد نہیں کرتیں۔“

”چاہے عملاً یہی کچھ کریں۔“ ثمنہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں، چاہے عملاً یہی کچھ کریں۔“ شملانے سر کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن قبل از وقت اعلان کوئی نہیں کرتا۔“

”مجھے منافقت اچھی نہیں لگتی۔ اس لیے پہلے ہی شرط عائد کر دی۔“

شہلا اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ”بہتر یہی ہے کہ اب مجھے اصل بات بتادو۔ مجھ سے تو تم کچھ چھپا نہیں سکتیں۔“

ثمینہ نے سر جھکا لیا۔ بات درست تھی۔ شملہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی اور اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ یقیناً اس سے حقیقت اگلا لیتی۔ جب کہ ثمینہ نہیں چاہتی تھی کہ بات کھلے۔ ”سنو شملہ۔ اگر تم وعدہ کرو کہ بات میرے اور تمہارے درمیان ہی رہے گی تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے..... وعدہ۔ میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی۔“

ثمینہ نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ جانتی تھی کہ شہلا جھوٹا وعدہ کبھی نہیں کرتی۔
 ”میں جانتی ہوں شہلا کہ شادی سے پہلے کسی لڑکی کی یہ شرط معیوب ہے کہ وہ شوہر کے
 گھر میں ساس سرور نند دیور کے ساتھ رہنے کے بجائے اپنا الگ گھر بسانا چاہتی ہے
 لیکن کئی زاویوں سے اس کی افادیت ہے، جس نے مجھے یہ شرط عائد کرنے پر مجبور
 کر دیا۔“

”میں بھی اس افادیت کو سمجھنا چاہتی ہوں۔“ شہلا نے گہری سانس لے کر کہا۔

”پہلے تو یہ بتا دوں کہ میں چھ ماہ بعد خود اپنی سسرال جانا پسند کروں گی۔“ شبنم نے شہلا کو حیران کر دیا۔

”تو پھر ابتداء ہی سے علیحدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

”وہی تو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ عام طور پر بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کرنے والی خواتین دراصل اپنے لیے بہو تلاش کر رہی ہوتی ہیں، اپنے بیٹے کے لیے شریک حیات نہیں۔ جو خاتون میری شرط مانیں گی، وہ اس طرح دو باتیں ثابت کریں گی۔

ایک تو یہ کہ وہ بیٹے کے لیے شریک حیات کی تلاش میں ہیں۔ دوسری یہ کہ میں انہیں اتنی پسند آئی ہوں کہ میری خاطر وہ بیٹے سے ہاتھ دھونے کے لیے بھی تیار ہیں۔

”عجیب منطق ہے۔ بہر حال کہتی رہو۔ میں سن رہی ہوں۔“

”دوسری افادیت سنو۔ شادی کے فوراً بعد فطری بات ہے کہ میاں بیوی زیادہ وقت ساتھ گزارتے ہیں۔ یہ بھی فطری بات ہے کہ شوہر کی ماں یہ بہت بڑی تبدیلی قبول نہیں کر پاتی۔ اسے نظر انداز کیے جانے کا احساس ہوتا ہے اور وہ بدرجہ رقبہ میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ابتدائی عرصہ دور گزرے گا تو یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔“

”بہت خوب۔“

”اور تیسری بات یہ ہے کہ میں یہ دو طرفہ احساس پیدا کرنا چاہتی ہوں کہ ساتھ رہنا میری مجبوری نہیں۔ میں جب ساتھ رہوں گی تو اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے رہوں گی پھر میں بھی زیادہ آسانی سے سمجھوتے کروں گی اور وہ بھی، بس اتنی سی بات ہے۔“

”یہ باتیں کہنے کی حد تک اچھی اور خوب صورت ہیں لیکن عملی زندگی میں فلسفہ نہیں چلتا۔“ شہلا نے تنبیہ کی۔ ”یہ تو ابتدا میں ہی بات خراب کرنے والی بات ہے۔ تمہاری ساس کو تو یہ شکایت ہوگی کہ تم نے ہوجنے سے پہلے ہی بیٹے کو ان سے چھین لیا.....“

”اگر انہیں یہ سوچنا ہوگا تو وہ یہ شادی کریں گی ہی کیوں اور شادی کریں گی تو گویا خود ہی بیٹے سے دستبردار ہو رہی ہوں گی۔“

”پھر وہ بعد میں یہ نہیں سوچیں گی کہ تم ایسی زندگی سے گھبرا کر سب کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ یعنی مجبور ہو گئی ہو۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے بھئی۔ تم جانو۔“ شہلا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”آئی نے کہا تھا کہ
 میں تمہیں سمجھاؤں۔ یہاں الٹا تم مجھے سمجھا رہی ہو۔“

”تم بس امی کو بتا دو کہ وہ لوگ بات پکی کرنے آئیں تو انہیں یہ بات کہہ دیں۔“
شہلا کسی گھر سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا۔ ”ایک بات

سچ مچ بتاؤ گی؟“

”پوچھو۔“

”بجائے اتنا طویل چکر چلانے کے تم اس رشتے سے صاف انکار کیوں نہیں کر دیتیں؟“

”اس لیے کہ انکار کرنا ہی نہیں چاہتی۔ امی اور ابا جان کو وہ صاحب اور ان کے والدین بہت اچھے لگے ہیں۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔“

”سچ کہو۔ کوئی پرانی ٹیس تمہیں شادی کے خلاف مزاحمت پر تو نہیں اکساتی؟“

”اگر تمہارا اشارہ ثاقب کی طرف ہے تو تم خود بھی جانتی ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ ثاقب کی میرے لیے اتنی اہمیت تو نہیں۔“

شہلا اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ”بعض اوقات انسان کو..... خاص طور پر ہم لڑکیوں کو محبت کا پتا نہیں چلتا۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”پھر تمہارے اور اس کے درمیان اتنا طویل تعلق رہا ہے۔ کون جانے تم.....“

”مجھے اس سے انکار نہیں کہ اتنی طویل نسبت نے میرے دل میں ثاقب کے لیے انیت پیدا کر دی تھی۔ یہ تو فطری بات ہے لیکن اسے محبت نہیں کہا جاسکتا پھر جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو مجھے نہ رنج ہوا نہ افسوس۔ اس کے برعکس میں نے سکون کی سانس لی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اپنے تخیل کو بے لگام نہ ہونے دو۔“

”تمہارا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن پھر کہوں گی کہ اپنے دل کو ٹٹولتی رہا کرو۔“

”اچھا بس۔“ شینہ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ موضوع ختم۔ اب کوئی اور بات کرو۔“

شہلا کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی۔ اس نے اور باتیں شروع کر دیں۔

☆=====☆=====☆

عمران اس دوسرے کمرشل کو جلد از جلد کر لینا چاہتا تھا۔ دوسری طرف ذہن کا یہ حال تھا کہ بنجر زمین کی طرح ہو گیا تھا۔ تخلیقی کاموں میں ایسا ہوتا ہے اور جب ایسی کیفیت طاری ہو جائے تو اس کے دوران آدمی بے یقینی کی آخری حد کو پہنچ جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس میں کبھی صلاحیت تھی ہی نہیں۔ اپنے پچھلے کام پر بھی اعتماد نہیں رہتا۔ لگتا ہے کہ وہ بھی اتفاقاً سرزد ہو گیا تھا۔ اس ایک ہفتے میں عمران بھی اس کیفیت سے گزرا۔

پھر عین اس وقت جب وہ خود سے مایوس ہونے والا تھا، ذہن میں اسپانک جھماکا سا ہوا اور اسے آئیڈیا سوجھ گیا۔ اسے پالش کرنے میں دو دن لگے۔ دو ہفتے پورے ہونے

سے پہلے اس نے اپنا کام مکمل کر لیا۔

اس کی توقع کے عین مطابق اس کا یہ کمرشل بھی بہت پسند کیا گیا اور وعدے کے مطابق اسے انعام بھی اس کی توقع سے بڑھ کر ملا۔

پانچویں دن بخاری صاحب کی وساطت سے اسے پیغام ملا کہ اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔ وہ مقررہ وقت پر بورڈ روم میں داخل ہوا تو اس کے دل کے دھڑکنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ میٹنگ میں شاید دیگر تمام معاملات نمٹائے جاسکے تھے۔ صرف اس کا مسئلہ باقی تھا۔

ایم ڈی صاحب نے اس کی کارکردگی کو سراہا اور بتایا کہ بورڈ نے اسے ترقی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب وہ کمپنی کا ایگزیکٹو ہے۔ چند اہم ترین اکاؤنٹس اس کے حوالے کیے جا رہے ہیں جن میں وٹو کولا بھی شامل ہے۔

”اب یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی کہ ان مصنوعات کی پبلسٹی کے سلسلے میں تجربات کرتے رہو۔“ ایم ڈی صاحب کہہ رہے تھے۔ ”یہ تمام کمپنیاں اس بات کے خلاف ہیں کہ ٹی وی پر ایک ہی کمرشل دکھایا جاتا رہے۔ تمہیں سال میں کم از کم تین کمرشل بنانے ہوں گے ان کے اور اپروچ فریش ہونی چاہیے۔“

”یہ کام آسان نہیں ہو گا سر۔“ عمران نے بمشکل کہا۔

”اس صورت میں زیادہ مشکل نہیں ہو گا کہ تمہارے پاس ایگزیکٹو عہدہ ہو اور معقول بجٹ بھی ہو۔“ ایم ڈی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور اب ہم تمہیں پندرہ ہزار روپے ماہانہ سٹیری آفر کر رہے ہیں۔ مراعات اس کے علاوہ ہوں گی۔“

عمران گنگ ہو کر رہ گیا۔ یہ تو اس کی توقع سے بہت..... بہت زیادہ تھا۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ آفر قبول کرو گے یا نہیں؟“

”یہ..... یہ تو میرے لیے اعزاز ہو گا سر۔“

”بس اب تم جاسکتے ہو۔ کل تمہیں لیٹر مل جائے گا۔“

اپنے دفتر کی طرف آتے ہوئے عمران کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ قدرت نے اتنے کم وقت میں اسے کتنا زیادہ نواز دیا تھا۔ وہ اس وقت احسان مندی کے جذبے سے سرشار تھا لیکن اپنی میز پر پہنچتے ہی اسے ایک بار پھر زہرہ یاد آگئی۔ البتہ اس بار اس کی یاد نے اسے اداس نہیں کیا۔ ہاں اس کا جی چاہا کہ کاش اس وقت زہرہ اس کے پاس ہوتی

اور وہ اسے بتاتا کہ اس کے تخیل نے بہت کم وقت میں اسے کتنا کچھ دیا ہے..... اور یہ کہ وہ محض کلرک نہیں ہے۔ اسے یہ اندازہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ زہرہ کی توہین کو اس نے کس حد تک دل پر لیا تھا اور اب جب کہ وہ اس توہین کا جواب دے سکتا تھا تو زہرہ سے اس کا رابطہ ہی نہیں تھا۔ رابطہ ہونے کا امکان بھی نہیں تھا۔ یعنی وہ ازالہ نہیں کر سکتا تھا۔

کامیابی اچھے انسانوں کو عالی ظرف بنا دیتی ہے۔ اس وقت عمران کو بھی زہرہ بہت چھوٹی، غیر اہم اور قابلِ معافی لگی۔ اس نے سوچا، شاید زہرہ توہین نہ کرتی تو مجھے کامیابی کی اتنی لگن بھی نہ ہوتی۔ میں اتنی جدوجہد بھی نہ کرتا۔ ایک لحاظ سے اس کی کامیابی زہرہ کی ہی مرہونِ منت تھی۔ ویسے بھی زہرہ اب اس کے لیے وہ ماضی تھی، جس بے نانا ٹوٹ چکا تھا جسے اب لوٹ کر نہیں آنا تھا۔ تو اب وہ اسے خراب انداز میں کیوں یاد کرے۔

یہ بات تو اس نے ابتدا میں ہی سمجھ لی تھی کہ زہرہ اور اس کی محبت اب ماضی کا حصہ ہے اور ماضی پلٹ کر کبھی نہیں آتا۔ اسی لیے تو چھ ماہ پہلے اس نے اپنی ای سے کہہ دیا تھا کہ وہ جہاں چاہیں اس کا رشتہ طے کر دیں۔

”عمران..... اب ہم تمہاری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔“ ای نے اس سے کہا تھا۔

”اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہو تو بتا دو۔ ہم اسے ترجیح دیں گے۔“

”نہیں ای۔ ایسی کوئی بات نہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ میرے لیے جو کچھ پسند کریں گی وہ بہترین ہو گا۔“ یہ کہتے ہوئے عمران کے دل میں ٹیس سی اٹھی تھی۔

ای اور اس کی بہن فرزانہ اسی دن سے لڑکی تلاش کرنے میں لگ گئی تھیں۔ کبھی کبھی عمران سوچتا کہ کیا لڑکی تلاش کرنا اتنا مشکل اور دیر طلب کام ہے پھر وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا۔ اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ یہ کام کب ہوتا ہے۔

پھر ایک دن ای اور فرزانہ دونوں بہت خوش نظر آئیں۔ عمران سمجھ گیا کہ انہیں کوئی لڑکی پسند آگئی ہے..... بلکہ بہت زیادہ پسند آگئی لیکن اس نے کیرید نہیں کی۔ تین دن بعد فرزانہ نے خود ہی اس سے بات کی۔ ”بھیا..... ہم نے بھالی پسند کر لی ہے۔“

”اچھا۔“ عمران نے سرسری انداز میں کہا۔

”کیوں۔ اس کے بارے میں کچھ پوچھیں گے نہیں؟“ فرزانہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”بھئی تم نے پسند کی ہے تو یقیناً کوئی بے مثال لڑکی ہی ہوگی۔“

فرزانہ خوش ہو گئی۔ ”یہ تو ہے مگر آپ کو یہ پتا نہیں کہ ہم ان کی تصویر بھی لائے ہیں۔ دکھاؤں آپ کو۔“

عمران کو تصویر کی کوئی پروا نہیں تھی لیکن بہن کا دل رکھنے کے لیے اس نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”ارے واہ، دکھاؤ تو۔“

فرزانہ نے تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ پوسٹ کارڈ سے بڑے سائز کی رنگین تصویر تھی، جو کسی تقریب میں لی گئی تھی۔ تصویر میں ایک معمر خاتون کے ساتھ اکیس سال کی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ عمران لڑکی کو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بلاشبہ بہت حسین لڑکی تھی۔ غیر شعوری طور پر وہ اس کا موازنہ زہرہ سے کرنے لگا۔ زہرہ، خود بہت خوبصورت لڑکی تھی لیکن یہ لڑکی حسن میں زہرہ سے بہت آگے تھی۔ یہی نہیں، اس کے چہرے پر جو معصومیت تھی، وہ دل کو چھوئی محسوس رہی تھی۔ اسے دیکھ کر عمران کے دل میں ایک کچی، نیم دلانہ مسرت کی لہر اٹھی۔ اس کے لیے یہ ایک چھوٹی سی فتح ہوتی کہ اس کی بیوی

زہرہ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسے فوراً ہی یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس کا یہ رویہ بچکانہ ہے۔ وہ اس حسن اور معصومیت سے محظوظ ہونے کی بجائے اپنے انتہائی جذبے کی تسکین کر رہا ہے۔ اسے شرمندگی تو ہوئی لیکن اسے اپنی سوچ پر اختیار بھی نہیں تھا۔

اس نے تصویر فرزانہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بہت اچھی ہیں لیکن عمر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔“

فرزانہ نے حیرت سے سے دیکھا پھر مسکرانے لگی۔ ”مذاق کر رہے ہیں۔ یہ بھالی کے ساتھ ان کی ای ہیں۔“

”اوہ..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“

اور یہ اسی روز کی بات تھی، جب بخاری صاحب نے اسے دوسرا پروجیکٹ دیتے ہوئے روشن مستقبل کی نوید سنائی تھی۔

عمران نے یہ بات بارہا سنی تھی کہ روپیہ پیسہ عورت کے نصیب سے ہوتا ہے۔ اب وہ اس صورت حال کو اسی زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ جس روز زہرہ سے قطع تعلق ہوا تھا، اس کے اگلے روز ہی اسے کمپنی کا انٹرویو لیٹر ملا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے لیے کوشش بہت پہلے سے کر رہا تھا اور اس کے پاس سفارش بھی بہت بگڑی تھی۔ شاید یہ اس بات کی

علامت تھی کہ زہرہ اس کے لیے مبارک نہیں تھی۔

اور اس لڑکی ٹینہ کو امی نے جس عرصے میں پسند کیا، اس میں وہ دمنو کولا کا کرشل کر رہا تھا۔ جس روز امی اور فرزاند اس کی تصویر لائیں، وہ دفتر میں بخاری صاحب سے دمنو کولا کے سلسلے میں داد وصول کر رہا تھا۔ اسے روشن مستقبل کی نوید سناتے ہوئے ایک اور اہم کام سونپا جا رہا تھا۔ تو کیا یہ لڑکی ٹینہ جو امی اور فرزاند کو بہت زیادہ پسند آئی ہے، اس کے اور اس کے مستقبل کے لیے مبارک ہے۔

عمران کو اچانک احساس ہوا کہ شاید ترک تعلق کے باوجود وہ ترک محبت نہیں کر سکا ہے۔ اس باری ہوئی محبت سے لڑنے کے لیے، اسے دل سے نکالنے کے لیے وہ ان تاویلات کا سہارا لے رہا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ ایک دیانت دارانہ ازدواجی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل سے محبت کے اس آسیب کو شعوری کوشش کے ذریعے نکال باہر کرے۔ ورنہ یہ تو ٹینہ کے ساتھ زیادتی ہوگی اور یہ کام کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ وہ خوب دیکھ چکا تھا کہ زہرہ کس قدر سطحی لڑکی ہے۔ اس کے نزدیک کامیابی بھی دولت سے ناپی جانے والی چیز ہے اور جہاں تک خوب صورتی کا تعلق ہے، ٹینہ زہرہ سے بدرجہا خوب صورت ہے۔

اس نے سر جھکا، جس کی اب اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ اس نے سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے خود کو یاد دلایا کہ اب دفتری ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں اور وہ ان سوچوں میں وقت ضائع کرنے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اب اسے قوت متحیلہ سے ملام مال عملی آدمی بننا ہے۔ تخلیق کے سلسلے میں استعمال کرنا ہے۔ اسے خود کو ڈسپلن کرنا ہوگا۔

☆=====☆

اس شام ایاز محمود بہت پریشان نظر آرہے تھے۔ ”بھئی آپ کیوں پریشان ہیں۔“ دردانہ بیگم نے ان سے کہا۔ ”پریشان تو مجھے ہونا چاہیے۔“

”اسی لیے تو پریشان ہوں کہ تم پریشان کیوں نہیں ہو۔“ ایاز صاحب نے برجستہ کہا۔

”واقعی، پریشان تو مجھے ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوں۔“ دردانہ بیگم بولیں۔ ”شاید اس لیے کہ مجھے یقین ہے، ٹینہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ عمران کو بہت خوش رکھے گی۔ یہی نہیں، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ بلاآخر ہمارے ہی ساتھ آکر رہے گی۔“

”اس یقین کی کوئی وجہ؟“

”بات یہ ہے کہ وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ اولاد کی بہت اچھی تربیت کی ہے انہوں نے۔ آپ نے دیکھا نہیں، اس شرط کا تذکرہ کرتے وقت وہ لوگ کتنے شرمندہ نظر آرہے تھے۔ کتنی معذرت تھی ان کے لہجوں میں۔“

”تو پھر؟“

”ایسے گھر کی بچی ایسی کوئی شرط عائد کرے تو ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔ کیا پتا، وہ ہمیں آزما رہی ہو۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ آخر میں وہ ساتھ ہی رہے گی۔ مجھے نہ تو وہ سرکش لگتی ہے نہ نافرمان۔“

”عجیب منطق ہے تمہاری۔“ ایاز صاحب جھنجھلا گئے۔ ”شرط یہ سوچ کر قبول کر رہی ہو کہ اس پر عمل درآمد نہیں ہوگا۔ بعد میں رووگی اور بہو کر برا بھلا کہوگی۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ دردانہ بیگم نے بے حد رمان سے کہا۔ ”اگر وہ الگ بھی رہے تو مجھے دکھ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی ایسی بہو لے آئے، جو ابتدا میں تو ساتھ رہے اور بعد میں تلخی اور لڑائی جھگڑے کے بعد علیحدہ ہوئی تو وہ زیادہ تکلیف دہ بات ہوگی۔ یہ بات بہتر ہے کہ ابتدا ہی سے بیٹا علیحدہ رہے پھر میں رواجی ساس بھی نہیں۔ دل سے کہہ رہی ہوں کہ اسے بیٹی کی طرح چاہوں گی۔ تو ممکن ہے کہ میں اسے جیت لوں۔ نہیں تو کوئی فرق پڑتا۔ میں تو عمران کی خوشی میں خوش ہوں۔“

”ہاں۔ یہ معقول بات ہے۔“ ایاز صاحب نے سر ہلا کر کہا۔

دردانہ بیگم نے انہیں بہت غور سے دیکھا۔ ”خیر مائیں تو بیٹوں سے چٹ کر رہنا چاہتی ہیں۔ باپ تو ایسے نہیں ہوتے۔ آپ کیوں پریشان ہیں۔“

”میں تو عمران کی طرف سے پریشان ہوں۔“ ایاز صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”وہ یہ شرط سن کر بھڑک جائے گا۔ میں یہ نہیں چاہتا۔ ہمارے معاشرے میں شادی محض دو افراد کا نہیں، دو گھرانوں کا ملاپ ہوتی ہے۔ مجھے یہ لوگ بہت اچھے لگے ہیں۔ میں یہاں ہر حال میں رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک اس شرط کا تعلق ہے تو میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“

دردانہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ چند لمحے بعد انہوں نے کہا۔ ”تو ایسا کرتے ہیں کہ عمران کو اس شرط کے بارے میں بتاتے ہی نہیں۔ ہم اس سے کہہ دیں گے کہ ہم چاہتے

ہیں کہ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ گھر میں رہے۔“
 ”بچکانہ بات مت کرو۔“ ایاز صاحب نے درشتی سے کہا۔ ”اتنے بڑے معاملات میں جھوٹ سے کام نہیں چلتا۔ بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو جانتی ہو، کتنی بڑی خرابی پیدا ہوگی۔ ہمیں عمران کو سب کچھ سچ سچ بتانا ہوگا۔“
 ”خیر، آپ فکر نہ کریں۔ عمران کو میں سنبھالوں گی۔“

☆=====☆=====☆

دردانہ بیگم اور ایاز محمود کو اندازہ نہیں تھا کہ دوسری طرف بھی اس مسئلے پر ایسی ہی گفتگو ہوئی تھی۔ انیس الرحمان سے ان کی بیوی سلطانہ نے بھی یہی کہا تھا کہ ثمنہ کو ایک طرف ہٹا کر بات اپنے اوپر لے لی جائے۔

”نہیں بیگم۔ یہ غلطی ہرگز نہ کرنا۔“ انیس صاحب نے کہا تھا۔

”کیوں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح ثمنہ کا تاثر تو خراب نہیں ہوگا۔“

”دیکھو..... ایک تو یہ بات انہیں عجب لگے گی کہ ابتدا میں ہم نے کوئی شرط نہیں لگائی۔ بلکہ ہمیشہ بہت اچھی طرح ان کی پذیرائی کی۔ اب انہیں ہمارا یہ مطالبہ غیر فطری معلوم ہوگا اور وہ بدگمانیوں میں مبتلا ہونے لگیں گے۔ وہ سوچیں گے کہ ہم یہ رشتہ کرنا نہیں چاہتے۔ یوں ایک بے حد منفی تاثر ان پر مرتب ہوگا پھر وہ اس کی وجوہات پر بھی سوچنے بیٹھ جائیں گے۔ خواہ مخواہ کی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ دوسرے اتنے بڑے معاملات میں جھوٹ بولنا بھی نہیں چاہیے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ثمنہ کا مطالبہ ہے۔ ورنہ بعد میں یہ بات سامنے آئے گی تو بڑی تلخیاں پیدا ہوں گی۔“

”مگر یہ تو سوچیں کہ اس طرح بات ختم بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے وہ لڑکا اتنا اچھا لگا ہے کہ پتا نہیں سکتی۔“

”مجھے وہ لڑکا تم سے زیادہ اچھا لگا ہے۔ مجھے اس کی فیملی بہت پسند آئی ہے۔ میں بھی یہ رشتہ نہیں گنوانا چاہتا لیکن جھوٹ بولنے کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری بیٹی نے کیسے عجیب نظریات پال رکھے ہیں۔“

”یہ بھی خوب ہے۔“ سلطانہ تلخی سے مسکرائیں۔ ”وہ کوئی ناپسندیدہ حرکت کرے تو میری بیٹی۔ ورنہ آپ کی ہے۔“

”ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ فکر کرو کہ ان سے یہ بات کیسے کہی جائے۔“

”یہ فکر آپ کریں۔ اس لیے کہ یہ بات آپ ہی کو کہنی ہے ان سے۔ مجھ پر چھوڑیں گے تو میں تو اپنے سر لے لوں گی وہ شرط۔“
 ”ٹھیک ہے۔ میں ہی دیکھ لوں گا۔“ انیس صاحب بولے۔

☆=====☆=====☆

عمران اس روز بہت خوش تھا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ گھر پہنچتے ہی خوش خبری سب کو سنا دے لیکن اس نے خود کو روک رکھا۔ یہ خوش خبری کھانے کے بعد ہی بہتر رہتی۔ امی کا مزاج ایسا تھا کہ خوشی ہو یا پریشانی، ان کی بھوک مرجاتی تھی۔

لیکن کھانے کے دوران اسے اندازہ ہوا کہ امی اس سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ وہ کچھ فکر مند بھی نظر آ رہی تھیں اور ہچکچا بھی رہی تھیں۔

”کیا بات ہے امی۔ کچھ پریشان ہیں؟“ اس نے امی سے کہا۔

”نہیں تو۔ بلکہ میں تو خوش ہوں۔“

”لگتا تو نہیں ہے ایسا۔ میرا خیال ہے، آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔“

دردانہ بیگم نے گہری سانس لی۔ ”ہاں۔ بات تو میں کرنا چاہتی ہوں۔ تمہاری شادی سے متعلق ہے۔“

”شادی؟ یہ معاملہ تو میں پوری طرح آپ کے سپرد کر چکا ہوں۔ آپ کو مکمل اختیار ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔“

دردانہ بیگم قدرے مطمئن نظر آنے لگیں۔ ”یہ تو تمہاری سعادت مندی ہے بیٹے لیکن پھر بھی کچھ باتوں کا تمہارے علم میں آنا ضرور ہے۔“

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا.....“

عمران نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ ”ٹھیک ہے امی۔“ اس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے میں یہ بتا دوں کہ یہ لڑکی ثمنہ مجھے اتنی اچھی لگی ہے کہ اب دنیا کی کوئی لڑکی میری نظروں میں نہیں بچ سکتی۔ پھر گھرانا بھی بہت اچھا ہے۔ یعنی تمام انفرادی اور اجتماعی خوبیاں اس رشتے میں موجود ہیں۔ میں یہ تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ اس لڑکی کو ہونا کے لیے میں ہر شرط قبول کر سکتی ہوں اور یہ صرف میرے ہی نہیں، تمہارے ابو کے بھی یہی جذبات ہیں۔“

عمران نے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ سر کو تائیدی جنبش دیتے ہوئے بولے۔ ”یہ

درست ہے بیٹے۔ اگر ان کی جگہ میں بیان کر رہا ہوتا تو شاید اس سے زیادہ ہی تعریف کرتا۔ وہ لوگ واقعی بہت اچھے ہیں بیٹے۔
”تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“ عمران قدرے جھنجھلا گیا۔ ”میں تو پہلے ہی امی کو مکمل اختیار سوچ چکا ہوں۔“

”سوچ لو۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں وہ اختیار واپس لے لو۔“ ایاز صاحب نے کہا۔
”آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔“ عمران کے لہجے میں شکایت تھی۔

”یہ بات نہیں بیٹے۔“ دردانہ بیگم نے جلدی سے کہا۔ ”ایک بات ایسی ہے کہ مجھے تو وہ اہم نہیں لگی لیکن تم اس پر بھڑک سکتے ہو۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد تمہیں اپنا گھر الگ بسانا ہوگا۔ تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے۔“
عمران بری طرح چونکا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے امی۔ کیا یہ ان لوگوں کی شرط ہے؟“
”ان لوگوں کی نہیں، یہ شینہ کی شرط ہے۔“ دردانہ بیگم نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

”اور یہ میرے لیے ناقابل قبول ہے۔ یہی نہیں، اب تو میں اس لڑکی کو بھی قبول نہیں کر سکتا۔“

”تم خواہ مخواہ بھڑک رہے ہو۔ اگر یہ بات میرے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے تو تمہارے لیے کیوں نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں امی۔ یہ ممکن ہی نہیں۔۔۔۔۔۔“ عمران اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم بھول رہے ہو کہ مجھے مکمل اختیار دے چکے ہو۔“

”امی۔۔۔۔۔۔ میں اس لڑکی کو کبھی عزت نہیں دے سکوں گا۔ محبت تو بہت دور کی بات ہے۔“

”بس آئندہ اختیار کی بات مت کرنا۔“ دردانہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

عمران نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ بولے۔ ”بیٹا، تم اس بات کو اہمیت نہیں دے رہے ہو کہ میں اور تمہاری امی دونوں اس شرط کے باوجود تمہاری شادی وہیں کرنا چاہتے ہیں تو کوئی خاص بات ہی ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ اس شرط کے باوجود وہ لڑکی ہمیں تفرقہ ڈالنے والی نہیں لگتی۔“

”اور تم اس انداز میں نہیں سوچتے کہ اگر کسی لڑکی نے تمہاری بیوی بننے کے بعد

صرف علیحدہ گھر بسانے کے لیے اس گھر کو جنم بنا دیا تو کیا کرو گے۔“ دردانہ بیگم نے کہا۔
”تب بھی تو علیحدگی اختیار کرنا پڑے گی تمہیں۔“
”جی نہیں۔ میں اس پر بیوی سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہوں لیکن ایسا نہیں کر سکتا۔“

”یہ بات غیر حقیقت پسندانہ ہے۔“ ایاز صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔ ”لیکن ابھی تم اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اولاد کی خاطر مرضی کے خلاف بھی بہت کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے بیٹے، ہم زیادہ سمجھتے ہیں، زندگی گزار چکے ہیں۔ جب کہ تم زندگی شروع کرنے والے ہو۔“

تخیل کے حوالے سے ایک طعنہ تو عمران کے دل میں پہلے ہی سے چھ رہا تھا۔ حقیقت پسندی کا یہ درس اسے بہت برا لگا لیکن جانتا تھا کہ ابو نے محبت سے یہ بات کہی ہے اور اس میں صداقت بھی ہے۔ ”ٹھیک ہے امی۔ آپ کو اختیار پہلے ہی دے چکا ہوں۔ آپ جو چاہیں کریں لیکن شرط کے جواب میں ایک شرط میری بھی ہے مکان یا فلیٹ جو بھی ہو، وہ لوگ مجھے دیں گے۔“

دردانہ بیگم اور ایاز محمود دونوں سنائے میں آگئے پھر ایاز صاحب نے سنہلے ہوئے کہا۔ ”بیٹے، یہ مناسب نہیں کہ شرط کے جواب میں شرط عائد کی جائے۔“

”بس تو پھر اس رشتے کا خیال دل سے نکال دیں۔“ عمران نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ”میری شرط بھی حتمی ہے۔“ جاتے جاتے اس نے پلٹ کر کہا۔

دردانہ بیگم اور ایاز محمود نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایاز محمود مسکرائے۔ ”چلو اچھا ہے۔ شرمندگی بھی برابر ہو جائے گی۔“ انہوں نے کہا۔ ”اولاد شرمندہ کرانے پر آجائے تو خوب شرمندہ کراتی ہے۔ اب کل ہماری شرمندگی کا دن ہے۔ تیاری کرلو۔“

دردانہ بیگم کچھ نہیں بولیں۔ ان کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔

☆=====☆

انیس صاحب نے پوری بات سننے کے بعد ایاز محمود اور دردانہ کو دیکھا، جو مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے اور بے حد شرمندہ نظر آرہے تھے۔ ”تو بھائی آپ ایسے سر جھکا کر کیوں بیٹھ گئے؟“ انہوں نے کہا۔

”آپ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ بات کہہ کر ہم کتنے شرمندہ ہیں۔“ ایاز صاحب نے سر

اٹھائے بغیر کہا۔ ”ہمیں یہ رشتہ عزیز نہ ہوتا تو ہم کبھی آپ کا سامنا نہ کرتے۔“
 ”ہم سمجھ سکتے ہیں۔“ انیس صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ ہم پہلے ہی اس مرحلے سے گزر چکے ہیں اور ہماری شرمندگی زیادہ بڑی تھی۔ کیونکہ ہم لڑکی والے تھے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم پر کیا گزری تھی۔“
 ”میں یہ سوچ کر حیران ہوں کہ اولاد انسان کو اتنا شرمندہ بھی کر سکتی ہے۔“ ایاز محمود بولے۔

”ہوتا ہے ایاز صاحب۔ بچے ہیں لیکن اس میں عمران کو قصور وار نہیں سمجھتا۔ اس کا رد عمل فطری ہے۔ ثنینہ کی بے ہودہ شرط کے جواب میں اسے بھی کوئی نہ کوئی شرط تو لگانی ہی تھی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ جوابی شرط عائد کرتے ہوئے اس نے ثنینہ کی شرط کو ہی سامنے رکھا۔ اس سے اچھی شرط لگائی نہیں سکتا تھا وہ۔“
 ”آپ بھی کمال کرتے ہیں بھائی صاحب۔“ دردانہ بیگم بولیں۔ ”ہمارا تو شرمندگی سے برا حال ہے۔“

”شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں بہن۔“ انیس صاحب نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک راز کی بات بتا رہا ہوں۔ عمران میاں کو فلیٹ تو میں دیے ہی دے رہا تھا اور ثنینہ کی شرط کے بعد میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ فلیٹ عمران ہی کے نام کروں گا۔ اب اگر عمران میاں نے کچھ مانگا ہے تو وہ درحقیقت ان کی اپنی ہی چیز ہے۔ اس سے نہ آپ پر کچھ اثر پڑتا ہے نہ ہم پر۔ اس بات کو دل پر نہ لیں۔“
 ”یہ تو آپ کی اعلیٰ طرفی ہے بھائی صاحب کہ بات اس طرح برابر کر رہے ہیں۔“
 دردانہ بیگم نے کہا۔

”یہ بات نہیں۔“ سلطانہ پہلی بار بولیں۔ ”میں اس بات کی گواہ ہوں کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے، سچ ہے۔ یہ بات تو ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔“
 ایاز صاحب نے نظریں اٹھائیں۔ ”ہم بہر حال آپ کے شکر گزار ہیں۔“
 ”شکر گزار تو ہمیں ہونا چاہیے۔ اصولاً تو ثنینہ کی شرط پر یہ رشتہ ہی ٹوٹ جاتا تھا۔ خیر، اب اس موضوع پر آئندہ بات نہیں ہوگی۔“ انیس صاحب بولے۔
 ”تو اب ہم تاریخ لینے آجائیں؟“ دردانہ بیگم نے پوچھا۔ سلطانہ مسکرائیں۔ ”جب آپ کا جی چاہے۔ بس ہمیں مطلع کر دیجئے گا۔“

☆=====☆=====☆

سب کچھ اتنی تیزی سے بدلا تھا کہ عمران خود بھی حیران تھا۔ دفتر میں اب اس کا ایک الگ کمر تھا، ایک سیکرٹری بھی تھی۔ کئی دن تک تو وہ اس کمرے میں یوں داخل ہوتا رہا، جیسے کسی اور سے ملنے کے لیے آیا ہو۔ وہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ وہ اس سے مطابقت پیدا نہیں کر پا رہا تھا۔

اس عرصے میں ایک بات مایوس کن ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی فلیٹ یا مکان کی شرط کے بعد وہ رشتہ ختم ہو جائے گا لیکن امی نے اسے بتایا کہ لڑکی والوں نے بلا تامل اس کی شرط قبول کر لی ہے۔ حسب سابق وہ دیر تک لڑکی اور اس کے گھر والوں کی تعریف کرتی رہیں۔

عمران ثنینہ کے سلسلے میں تضادات کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک طرف تو اسے اس سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ صرف اس کی وہ شرط تھی۔ وہ سوچتا کہ جو لڑکی شادی سے پہلے اس طرح شرط عائد کر رہی ہے، وہ کیسا تحملانہ مزاج رکھتی ہوگی۔ ایسی لڑکی کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا تصور اس کے لیے بے حد ڈراؤنا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ہر وقت اسے بتاتی رہے گی کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو پھر اپنے گھر سے دوری کا تصور بھی بہت ناگوار تھا۔

البتہ ایک بات اس کی ڈھارس بندھاتی تھی۔ امی اور ابو نے اس شرط کو اتنی خوش دلی سے اور ذرا ہچکچائے بغیر قبول کیا تھا تو اس کا واضح مطلب تھا کہ انیس لڑکی بھی بہت زیادہ پسند آئی ہے اور اس کے گھر والے بھی۔ ورنہ مائیں تو شادی کے بعد بھی بیٹوں کی علیحدگی کے تصور کو آسانی سے قبول نہیں کرتیں۔ امی کا کہنا کہ اول تو لڑکی کی شرط کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ وہ اسے اس کے گھر والوں سے الگ کرنا چاہتی ہے پھر اسے محبت سے جیتا بھی جاسکتا ہے۔ انہوں نے عمران سے کہا تھا کہ وہ خود اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ممکن ہے، لڑکی نے روایتی ساسیں دیکھی بھی ہوں اور ان کے قصے بھی پڑھے ہوں۔ اس وجہ سے وہ خائف ہو۔ تو وہ خوف اپنے طرز عمل سے دور بھی کیا جاسکتا ہے۔ امی نے یہ بھی دعوے سے کہا تھا کہ ثنینہ پورے گھر کو یکجا رکھنے والی اور گھر کو بنانے والی ہو ثابت ہوگی۔ امی اور ابو کی رائے کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال انہوں نے ایک دنیا دیکھی تھی اور اچھے برے کی پہچان انیس اس سے بہت زیادہ تھی۔

دوسری طرف اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ثینہ اس کے لیے مبارک ہے۔ اس کے علاوہ ثینہ کی تصویر نے بھی اسے بہت متاثر کیا تھا۔ وہ جس فیلڈ میں تھا اس میں آدمی میں قیافہ شناسی خود بخود آ جاتی ہے۔ اس فیلڈ میں آنے کے بعد لڑکیاں اس نے بہت دیکھی تھیں۔ ثینہ کے چہرے پر ہلا کی نری اور معصومیت تھی۔ ایسے چروں والی لڑکیوں کو اس نے بہت سخت اور حاکمانہ مزاج رکھنے والی بھی دیکھا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ آنکھیں بہت کچھ بتا دیتی ہیں۔ فطرت کی سختی آنکھوں میں ضرور جھلکتی ہے۔ جب کہ ثینہ کی آنکھیں بھی ایسی نہیں تھیں۔

ثینہ کی وہ تصویر اس نے لے لی تھی۔ وہ تصویر دیکھتا اور حیران ہوتا کہ کیا یہ لڑکی شادی جیسے معاملے میں ایسی شرط عائد کر سکتی ہے؟ عقل یہ بات تسلیم نہیں کرتی تھی لیکن ہوا یہی تھا۔ پھر عمران ایک اور زاویے سے اس بات کو سمجھے کی کوشش کرتا تو اور حیران ہوتا۔ یہ بات طے تھی کہ کوئی بے وقوف سے بے وقوف لڑکی بھی شادی سے پہلے ایسی کوئی شرط عائد نہیں کر سکتی۔ جن لڑکیوں نے پہلے سے ہی علیحدہ رہنے کا سوچا ہو، وہ بھی ایسی غلطی نہیں کرتیں۔ ہاں شادی کے بعد وہ حالات کو اس نہج پر لے جاتی ہیں، جہاں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے بھی وہ پہلے شوہر کا دل جیتنے کی ترکیبیں کرتی ہیں۔ تحکمانہ انداز اختیار نہیں کرتیں۔ بلکہ اطاعت شعار بیوی بن کر دکھاتی ہیں۔

تو پھر ثینہ نے حماقت کیوں کی؟ اس سوال کا ایک ہی ممکنہ جواب ذہن میں آتا تھا۔ وہ یہ کہ ثینہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتی اور عمران کے لیے یہ بات نہایت تکلیف دہ تھی۔ وہ تو ایک بار پہلے محبت کے معاملے میں رد کیا جا چکا تھا مگر پھر وہ سوچتا کہ جو لڑکی اتنے بولے انداز میں ایسی شرط عائد کر سکتی ہے، وہ شادی سے صاف انکار کیوں نہیں کر سکتی۔ جب کہ شرط کے مقابلے میں انکار زیادہ آسان ہے۔ یہ دلیل اتنی زوردار تھی کہ عمران الجھ کر رہ گیا۔

عمران کی ایک کمزوری تھی۔ وہ زہرہ سے زیادہ حسین لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ زہرہ بہت حسین لڑکی تھی لیکن تصویر سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ثینہ زہرہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین ہے اور سچی بات یہ ہے کہ عمران ثینہ کو پسند کرنے لگا تھا۔ اب تو اسے علیحدہ رہنے کی شرط کے معاملے میں بھی اچھائی کا پہلو نظر آنے لگا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ کم از کم اس لڑکی میں منافقت تو نہیں ہے۔ ورنہ لڑکیاں سسرال سے علیحدہ ہونے کے معام

میں سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے کے مقولے پر عمل کرتی ہیں۔ عمران نے ماں سے کہا کہ وہ ثینہ کو دیکھنا چاہتا ہے۔ دردانہ بیگم نے شادی کی ایک تقریب میں اس کا سامان بھی کر دیا۔ عمران نے ثینہ کو اس طرح دیکھا کہ ثینہ کو خبر تک نہیں ہوئی۔ یوں دیکھنے میں وہ پوری طرح ثینہ کا اسیر ہو گیا لیکن ساتھ ہی اس کی الجھنیں بھی بڑھ گئیں۔

ثینہ اپنی تصویر سے زیادہ حسین تھی۔ عمران اسے دیکھ کر مبسوت ہو گیا۔ یہ خیال اس کے دل میں سما گیا کہ اس لڑکی سے شادی کرنا اس کی خوش قسمتی ہی ہوگی۔ وہ اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرتا رہا لیکن ان میں سختی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ وہ تو بہت نرم خو، خوش اخلاق، خوش اطوار اور خوش گفتار لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی الجھن اور بڑھ گئی کہ ایسی لڑکی اس طرح کی شرط عائد کر سکتی ہے؟

بہر حال اب وہ اس شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا..... بلکہ بے چینی سے منتظر تھا۔

☆=====☆=====☆

شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے عمران کی سیکرٹری نے اسے بتایا کہ کوئی صاحب اسے ملنا چاہتے ہیں۔ اپنا نام انیس الرحمن بتاتے ہیں۔ عمران کو حیرت ہوئی۔ وہ گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ انیس صاحب کا نام سن کر وہ خود کمرے سے نکل آیا۔ ”آپ نے کیوں زحمت کی۔ مجھے بلوایا ہوتا۔“ اس نے انیس صاحب کو سلام کرنے کے بعد کہا۔

”بس تمہیں ساتھ لے کر کہیں جانا تھا بیٹے۔ اسی لیے چھٹی کے وقت پر آیا ہوں۔“ انیس صاحب نے کہا۔

”آئیے..... بیٹھیں گے نہیں کچھ دیر؟“

انیس صاحب بیرونی کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ”کیوں نہیں۔“ انہوں نے بے دھیانی سے کہا۔ ”پانچ منٹ بیٹھنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“

عمران انہیں اپنے دفتر میں لے گیا..... دفتر کی آرائش دیکھ کر وہ اور متاثر ہوئے۔

”انکل..... کوئلہ ڈرنک لیں گے یا کافلی منگو اؤں؟“ عمران نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بیٹے۔ بس ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔“

عمران نے سیکریٹری سے پانی لانے کو کہا اور انیس صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اسی کو دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں سیکریٹری پانی لے آئی۔ انیس صاحب نے گلاس خالی کر کے طشتری پر رکھ دیا۔ سیکریٹری گلاس لے کر واپس چلی گئی۔

”ایک بات پوچھوں بیٹے۔ یہ دفتر تمہارے عہدے سے مطابقت تو نہیں رکھتا۔“ انیس صاحب نے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں اکل۔ تین ماہ پہلے مجھے ایگزیکٹو عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔“ عمران نے بتایا۔

”ہمیں تو علم نہیں اس کا۔“

”میں نے امی ابو کو منع کر دیا تھا۔ میں سربراہ دینا چاہتا تھا آپ لوگوں کو۔“

”اور مجھے واقعی حیران کر دیا تم نے۔ اچھا..... اب چلیں؟“

”جو حکم آپ کا جانا کہاں ہے؟“

”چلو تو۔ میں تو تمہیں سربراہ بھی نہیں دے سکتا۔“

عمران جھینپ گیا۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔ ”ٹرانسپورٹ کا کیا کرتے ہو تم؟“ انیس صاحب نے پوچھا۔

”جی..... بانیگ ہے میرے پاس۔“

”بانیگ یہاں چھوڑ دو تو کوئی حرج تو نہیں۔“ انیس صاحب نے پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، محفوظ تو رہے گی نا؟“

”جی ہاں۔ بشرطیکہ واپسی میں زیادہ دیر نہ لگے۔“ عمران نے جواب دیا۔

”دو گھنٹے تو لگیں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ اسے اپنی بلیو ٹیوٹا کرولا کے پاس لے گئے۔ انہوں نے چابی لگا کر دروازہ کھولا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے وہ گھوم کر آئے اور اس کے لیے دروازہ کھولا۔ ”بیٹھو۔“

عمران کو بہت شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک بزرگ کی طرف سے ایسا رسمی برتاؤ اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ جب کہ رشتہ بھی ایسا تھا۔

چند لمحوں بعد گاڑی پُرجوم سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ ”کام تمہارا بے حد دلچسپ ہے؟“ اچانک انیس صاحب نے پوچھا۔

کچھ دیر اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی پھر اچانک انیس صاحب نے موضوع بدل دیا۔ ”ڈرائیونگ آتی ہے تمہیں؟“

”جی ہاں۔ سیکھی تو ہے۔“

”اچھا کیا۔ کام آئے گی۔“

عمران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ گلستان جوہر کی طرف جارہے ہیں۔ ذرا دیر بعد اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ گلستان جوہر کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے اور اب اس طرف بڑھ رہے تھے، جہاں آبادی کم تھی۔ البتہ مختلف رہائشی پروجیکٹس کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔

انیس صاحب نے ایک اپارٹمنٹ ہاؤس کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ عمارت ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ رنگ روغن تک مکمل ہو چکا تھا۔ نیا پن الگ سے نظر آ رہا تھا۔ ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ بلڈنگ حال ہی میں مکمل ہوئی ہے۔ کچھ فلیٹ آباد نظر آ رہے تھے لیکن بیشتر ابھی خالی تھے۔ بلڈنگ کا صرف ایک ہی بلاک تھا۔ فلیٹ بھی بہت قیمتی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

انیس صاحب نے نیچے اتر کر گاڑی کو لاک کیا۔ عمران پہلے ہی اتر چکا تھا۔ اسی وقت ایک ادھیڑ عمر مگر تنومند آدمی ان کی طرف آیا۔ اس نے انیس صاحب کو بہت ادب سے سلام کیا۔ ”تم یہیں رکو رمضان۔“ انیس صاحب نے کہا۔ ”ہم بھی آتے ہیں۔“

”بہتر صاحب جی۔“

انیس صاحب عمران کو لے کر بلڈنگ کے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ زینے چڑھ کر وہ دوسری منزل پر پہنچے اور داہنی جانب والے فلیٹ کے دروازے پر رک گئے۔ انہوں نے جیب سے چابی نکالی اور عمران کی طرف بڑھائی۔ ”لو میاں، بسم اللہ کرو۔“

عمران گڑ بڑا گیا۔ ”کیا مطلب اُنکل؟“

”ارے بھئی، یہ تمہارا فلیٹ ہے۔ اب اسے دیکھو چل کر.....“ عمران ہچکچا رہا تھا۔ اس نے ابھی تک چابی لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

”لونا بیٹے۔ ہچکچا کیوں رہے ہو۔“

عمران نے چابی لی، دروازہ کھولا۔ پہلے اندر بھی وہی داخل ہوا۔ فلیٹ اس کے لیے جہان حیرت ثابت ہوا۔ وہاں صرف فرنیچر ہی نہیں تھا۔ بلکہ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

پکن تک میں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ فلیٹ میں پانچ کمرے تھے۔ تین بیڈروم تھے اور کہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی بڑی فیملی پہلے سے فلیٹ میں رہ رہی ہے۔ اگر ہر چیز ہی نہ ہوتی تو عمران کی سمجھتا کہ فلیٹ کسی کے استعمال میں ہے۔

”انکل..... یہ سب کیا ہے؟“ عمران نے متوحش ہو کر پوچھا۔

”یہ تمہارا فلیٹ ہے بیٹے۔ تم یہی چاہتے تھے نہ۔“

عمران شرمندگی سے کٹ کر رہ گیا۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ تو تمہاری شرط تھی بیٹے۔ اسی لمحے اس کی سمجھ میں امی اور ابو کی بات آگئی، جوان لوگوں کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اس لمحے اسے انیس الرحمن بہت اچھے لگے۔ ”پھر بھی انکل، اتنے بڑے فلیٹ کی کیا ضرورت تھی؟“ اس نے شرمندگی سے کہا۔

”ضرورت تو واقعی نہیں تھی لیکن میں نے سوچا شاید اتنے بڑے فلیٹ میں دو افراد رہیں تو کنبے کے ساتھ رہنے کی اہمیت ذرا جلدی سمجھ لیں گے۔“

عمران کو اور شرمندگی ہوئی۔ انیس صاحب کے لہجے میں طنز کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ بلکہ خلوص تھا۔ فلیٹ میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ جلد از جلد باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ ”اب چلیں انکل؟“ اس نے کہا۔

”چلتے ہیں۔“ انیس صاحب نے کہا۔ انہوں نے اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے کچھ دستاویزات نکال کر اس کی طرف بڑھائیں۔ ”یہ رکھ لو بیٹے۔“

عمران نے دستاویزات لے لیں اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ اس نے کانڈات پر نظر ڈالی۔ وہ فلیٹ کے مالکانہ حقوق کے کانڈات تھے..... اور ملکیت کے خانے میں اس کا نام تھا۔ ”یہ..... انکل یہ سب کیا ہے؟“

”یہ فلیٹ تمہارا ہی تو ہے بیٹے۔“

”لیکن اتنا پہلے..... میرا مطلب ہے انکل..... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ.....“ عمران کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی بات کس طرح کہے۔

”کچھ مت کہو۔ میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ انیس صاحب نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ”لیکن میاں، ازدواجی زندگی کی گارنٹی روپے پیسے سے، جائیداد سے اور چیزوں سے نہیں ہوتی۔ بگڑنے والی بات تو پھر بھی بگڑ جاتی ہے۔ میں نے یہ فلیٹ تمہیں غیر مشروط

ہے۔ اس کی کوئی شرط نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ زمانہ مطلب کا ہے۔ اس تحفے کے پیچھے میری بھی ایک غرض ہے۔ تم اسے اچھا سمجھو یا برا۔ میری غرض بڑی سچی ہے۔“

عمران انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی ہمت نہیں تھی کہ انہیں وضاحت کے لیے کہتا۔

”تم جانتے ہو، میری صرف تین بیٹیاں ہیں۔“ انیس صاحب نے خود وضاحت کی۔ ”بیٹے سے محروم ہوں میں۔ سو میں نے سوچا کہ کاروبار ہی کر لوں۔ بیٹی دے کر بیٹا اپنالوں لیکن بخدا، والدین سے چھین کر بیٹا لینا میرا مقصد نہیں۔ بس ایک بیٹا شیئر کرنا چاہتا ہوں تمہارے والدین کے ساتھ۔ تو عمران بیٹے، یہ ایک بیٹے کے لیے باپ کا تحفہ ہے۔ اسے اور کچھ نہ سمجھنا۔ یہ اب زندگی بھر تمہارا ہے، آؤ اب چلیں۔“

وہ باہر نکلے، عمران نے دروازہ لاک کر دیا۔ وہ نیچے نیچے تو اس ادھیڑ عمر آدمی کو منتظر پایا، جسے انیس صاحب نے نیچے رکنے کو کہا تھا۔ اس بار انیس صاحب نے تعارف کرایا۔ ”یہ میرا وفادار ملازم ہے رمضان۔“ انہوں نے کہا۔ ”اور عمران بیٹے، اب مجھے تم سے ایک اجازت درکار ہے۔“

”آپ شرمندہ کیوں کر رہے ہیں مجھے؟“ عمران نے بے بسی سے کہا۔

”یہ بات نہیں۔ جو چیز تمہاری ہے، اب اس کے سلسلے میں تمہاری اجازت ضروری ہے۔“ انیس صاحب نے کہا۔ ”یہ علاقہ اتنا زیادہ آباد نہیں ہے۔ بھرے ہوئے فلیٹ کو یونہی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اگر تم اجازت دو تو رمضان یہاں اس وقت تک رہے گا، جب تک تم لوگ نہیں آجاتے۔ چاہو تو چالی اسے دے دو۔“

عمران نے خاموشی سے چالی رمضان کو دے دی۔ واپسی کے سفر میں عمران نے کہا۔ ”آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔“

”نہیں میاں، تمہارا ساتھ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔“

وہ الفا ایڈورٹائزنگ پہنچے۔ انیس صاحب نے اپنی گاڑی باہر ہی روک دی پھر وہ عمران کے ساتھ اندر پارکنگ میں گئے۔ عمران اپنی بائیک کی طرف جانے لگا تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹے..... ابھی تمہاری ایک امانت اور ہے، میرے ساتھ آؤ۔“

عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس شام نے اسے سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں

چھوڑا تھا۔ وہ تو خواب کی سی کیفیت میں تھا۔
انیس صاحب اسے ایک بالکل نئی سوز کی مہران کے پاس لے گئے۔ انہوں نے
جیب سے چابی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ”بیٹے..... یہ کار بھی تمہاری ہے۔“

”یہ..... یہ تو زیادتی ہے انکل!“ عمران منمنایا۔

”کچھ بھی کہو گے تو میرا دل دکھے گا۔ میں دل کی بات تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں
تمہیں بیٹا سمجھتا ہوں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
عمران نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

ان کے جانے کے بعد بھی وہ دیر تک کھڑا رہا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ
کوئی لاپچی آدمی نہیں تھا لیکن یہ جو کچھ اسے دیا جا رہا تھا، یہ جہیز نہیں تھا۔ یہ تو بڑی محبت
سے دیے گئے تحفے تھے۔ جبکہ وہ ان کا مستحق بھی نہیں تھا۔

امی اور ابو کی کئی ہوئی ہر بات کا وہ قائل ہو چکا تھا۔ وہ لوگ واقعی بہت اچھے تھے۔
ایسے گھر میں شادی ہونے کو صرف خوش قسمتی ہی کہا جاسکتا ہے۔ سب کچھ تھا مگر ثمنہ کی
شرط اب بھی پھانس کی طرف اس کے دل میں چبھ رہی تھی۔ البتہ اب اس پھانس کی
تکلیف بہت کم..... بہت ہی کم رہ گئی تھی۔

لیکن ابھی اس کے لیے ایک حیرت اور باقی تھی! اگلے روز کوریروس سے دفتر
کے چپے پر اسے ایک خط موصول ہوا۔ اس نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا، لکھا تھا.....
”عمران بیٹے دعائیں۔“

کل تمہارے آفس آکر مجھے صرف حیرت نہیں ہوئی۔ تم پر فخر کا احساس بھی ہوا۔
تم نے جتنے کم عرصے میں اتنی ترقی کی ہے، اس سے تمہاری محنت اور صلاحیت کے متعلق
اندازہ ہو گیا۔ یہ یقین بھی ہوا کہ مستقبل میں انشاء اللہ تمہیں بہت آگے جانا ہے۔

میں کل تمہیں ٹھیک طور سے نہیں بتا سکا تھا۔ یہ بتانا آسان بھی نہیں۔ البتہ لکھنا
آسان معلوم ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے مجھے بیٹا دیا ہوتا تو میں اسے بھی اتنا ہی چاہ پاتا، جتنا
تمہیں چاہنے لگا ہوں۔ ممکن ہے، تمہیں میرے خلوص پر شک ہو مگر میری التجا ہے کہ ایسا
نہ کرنا اور میری محبت کو کبھی مشروط نہ سمجھنا۔ یہ درست ہے کہ یہ رشتہ طے نہ ہوتا تو میں
تم سے ملا بھی نہ ہوتا لیکن اب تم مجھے بیٹے ہی کی طرح عزیز ہو۔ میں ثمنہ کا احسان مند
ہوں کہ اسی کے واسطے سے تم مجھے ملے ہو۔

میں تو تمہارے لیے خواب بھی دیکھنے لگا ہوں۔ تم پانچ برس..... دس برس یہاں
کام کرو گے۔ تمہاری ترقی بھی ہوگی لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ تم بہت کچھ سیکھو گے۔
تمہیں پبلک ریلیشننگ بھی آئے گی۔ ایک وقت آئے گا کہ تم اپنا بزنس شروع کرنے کے
قابل ہو جاؤ گے۔ اس وقت تمہیں سرمائے کی ضرورت ہوگی۔ میرا مشورہ ہے کہ اس
وقت کے لیے ابھی سے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کرنا شروع کر دو۔ بسم اللہ میں نے
کردی ہے، ایک بات بتا دوں، یہ معاملہ بس باپ بیٹے کے درمیان ہے۔ تمہارے اور
میرے سوا کسی اور کو اس کا علم نہیں۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔

زندگی میں کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ۔

تمہارا اپنا انیس الرحمن۔“

خط کے ساتھ بینک کی ڈیپازٹ سلپ بھی منسلک تھی۔ رقم اسی دن جمع کرائی گئی
تھی۔ رقم کے خانے کو دیکھ کر عمران چکرا گیا۔ دس لاکھ روپے! یہ ناقابل یقین تھا لیکن سچ
تھا۔

اس بار وہ اپنے آنسو نہ روک سکا۔ ایسے خلوص والے لوگوں سے بھلا کوئی لڑ سکتا
ہے؟ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

شادی کے ہنگامے عروج پر تھے! گھر میں دن بھر ہنگامہ رہتا۔ لڑکیاں جمع رہتیں۔ ڈھولک بجتی، گیت گائے جاتے۔ عرفان اور فرحان دونوں دعوت ناموں کی تقسیم کے کام میں مصروف تھے۔ شادی میں اب چھ دن رہ گئے تھے۔ اگلے روز ثینہ کو مایوں بیٹھنا تھا۔ اس تقریب میں یہاں سے بھی خواتین کو شرکٹ کے لیے جانا تھا۔

عمران کو صرف پندرہ دن کی چھٹی ملی تھی۔ اس کی چھٹیاں بھی اگلے روز شروع ہو رہی تھیں۔ شادی کے گیارہویں دن اسے پھر دفتر جانا تھا۔ اگر وہ کوشش کرتا تو شاید زیادہ چھٹی مل جاتی لیکن اسے خود بھی چھٹیوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ایک سبب تو ثینہ کی شرط کی پھانس تھی، جس کی اب بھی ہلکی سی کلک تھی۔ دوسرے وہ انیس صاحب کی ترکیب کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اسے انیس صاحب کی بات یاد تھی۔ انہوں نے کہا تھا..... اتنے بڑے فلیٹ میں صرف دو افراد رہیں تو شاید کنبے کے ساتھ رہنے کی افادیت ان پر جلد روشن ہو جائے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے فلیٹ میں ثینہ تنہا پورا دن گزارے گی تو یقیناً یہ بات اور جلدی اس کی سمجھ میں آجائے گی۔

وہ دفتر کے لیے نکلنے لگا تو امی نے اسے شادی کے سوٹ کے متعلق یاد دلایا۔ ”جی امی، آج مجھے ٹرائی دینے ٹیلر کے پاس جانا ہے۔“ اس نے کہا۔

”اکیلے جاؤ گے؟“

”نہیں امی۔ شام کو وحید کو فون کر کے بلا لوں گا۔ وحید میرے ساتھ ہی آئے گا“

اس نے جواب دیا۔

یوں وہ چھٹیوں سے پہلے آخری بار دفتر جانے کے لیے نکلا۔

دفتر میں وہ تیزی سے کام نمٹانے میں لگا رہا۔ دن گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ویسے بھی وہ کام خاصا ایڈوانس کر چکا تھا۔ جو پروڈکشن اسے سوچنے گئے تھے، ان کے کرسٹلز کی کئی کاپیاں اس کے پاس تیار موجود تھیں۔ پبلٹی کا دوسرا میٹیریل بھی ایڈوانس ہی تھا۔

اس کا کام تسلی بخش طور پر چل رہا تھا۔ امید تو یہی تھی کہ دو ہفتے کی چھٹیوں میں کام پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا۔

ساڑھے چار بجے تک وہ تھک کر چور ہو چکا تھا لیکن کام بھی منٹ چکا تھا۔ وہ کرسی کی پشت گاہ سے سر نکا کر بیٹھ گیا۔ کبھی وہ کافی کا گھونٹ لینے کے لیے سر اٹھاتا اور میز پر جھکتا پھر اچانک اسے یاد آیا کہ اسے وحید کو فون بھی کرنا ہے لیکن ابھی وہ پندرہ منٹ آرام کرنا چاہتا تھا۔ تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے کافی کی پیالی خالی کر کے میز پر رکھی اور کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں وحید اپنے دفتر سے نہ نکل جائے۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بجنے میں دس منٹ کم تھے۔ وحید کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی۔

اس نے وحید کے دفتر کا نمبر ملایا۔ وہاں سے بتایا گیا کہ وحید نے آدھے دن کی چھٹی کی تھی اور ایک بجے دفتر سے نکل گیا تھا۔

عمران پر اضمحلال تو ویسے ہی طاری تھا۔ اب جھنجھلاہٹ بھی ہونے لگی۔ اس نے اپنی فون انڈیکس نکال کر سامنے رکھی اور وحید کے گھر کا فون نمبر ملانے لگا لیکن تیسرا ہندسہ دبتے ہی کلک سی سنائی دی اور ایک عورت کی آواز..... پھر ایک مرد کی آواز۔

لائن کر اس ہو رہی تھی۔ عمران نے ریسیور رکھ دیا۔

ایک منٹ بعد اس نے پھر نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن تیسرا ہندسہ دبتے ہی لائن پھر کر اس ہو گئی۔ ”تمہیں اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالنے تھے۔“ مرد کہہ رہا تھا۔

”میں نے وہ سب کچھ کیا، جو میں کر سکتی تھی لیکن.....“ یہ نسوئی آواز تھی۔

عمران نے جھنجھلا کر ریسیور ہنچ دیا۔

دو منٹ بعد اس نے پھر کوشش کی مگر اس بار بھی وہی کچھ ہوا۔ ”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ مرد کہہ رہا تھا۔

”میں بھی نہیں رہ سکتی۔“

”تم رہ لو گی.....“ مرد زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”کب ختم ہوں گی تم لوگوں کی باتیں؟“ عمران ماؤتھ پیس میں دباڑا لیکن حاصل کچھ بھی نہیں ہوا، دوسری طرف گفتگو جاری رہی۔

عمران نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کی جھنجلاہٹ اب عروج پر تھی۔ بے بسی کے احساس نے جھنجلاہٹ میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اگر یہ عاشق و معشوق ایک گھنٹے فون پر باتیں کرتے رہیں، تب بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ جبکہ وہ جلد از جلد ٹیلر سے نمٹ کر گھر پہنچنا اور آرام کرنا چاہتا تھا۔ آنے والے ایک ہفتے میں تو اسے آرام کا کوئی موقع نہیں ملنا تھا لیکن جلدی گھر پہنچا اسے ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہلے تو وہ وحید کو فون کر کے بلائے۔ وحید گلشن اقبال میں رہتا تھا۔ یہاں پہنچنے میں بھی اسے بیس منٹ تو لگتے پھر ٹیلر..... اور پھر گھر! لیکن پہلا مسئلہ یہ تھا کہ فون تو ملے۔ اس بار خود پر جبر کر کے اس نے پانچ منٹ خود کو وحید کا نمبر ٹرائی کرنے سے باز رکھا۔

اس بار اس نے بڑی امید سے نمبر ملانا شروع کیا۔ اس بار لائن کراس ہوئی تو اسے غصہ آ گیا۔ ریسیور کان سے دور، ہاتھ میں لیے جیسا وہ خود سے الجھتا رہا، دل یہ چاہتا تھا کہ سوٹ کی فنگر پر لعنت بھیج کر وہ گھر چلا جائے۔ ٹرائی کا کام کل پر رکھے لیکن اس میں قناعت یہ تھی کہ کل کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ بہتر یہ تھا کہ یہ کام آج ہی نمٹا لیا جائے لیکن یہ منحوس کراس لائن.....!

اس نے ریسیور والا ہاتھ اٹھایا اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے چیخنے دہانے سے لائن کلیئر نہیں ہوگی مگر وہ دہانے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ اپنے اندر کی جھنجلاہٹ کو غلیظ گالیوں کی شکل میں مانتھ پیس میں انڈینا چاہتا تھا۔ اس کے ہونٹ ہلے، لیکن پھر اچانک وہ ساکت ہو گیا۔ وہ تو جیسے سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔ اسے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ دوسری طرف تو بہت حساس نوعیت کی گفتگو ہو رہی ہے۔

وہ جانتا تھا کہ یوں دو افراد کی گفتگو سننا بہت معیوب بات ہے لیکن اب وہ سننے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ریسیور اس کے کانوں سے لگا تھا..... اور وہ ہمہ تن سماعت ہو گیا تھا۔

”تم یقین کر لو۔ میں اس شخص کو قتل کر دوں گا“ جس سے تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“ یہ وہ جملہ تھا جس نے عمران کو وہ کراس ٹاک سننے پر مجبور کر دیا تھا۔ بات لفظوں کی نہیں تھی۔ جس انداز میں وہ جملہ کہا گیا تھا، وہ بے حد خوف ناک تھا۔ عمران لفظوں اور لہجوں کی دنیا کا آدمی تھا۔ یہ جملہ نہ تو غصے میں ادا کیا گیا تھا اور نہ ہی ادا کرنے والے کی

جذباتیت کا مظہر تھا۔ وہ بے حد غیر جذباتی، خوف ناک حد تک سادہ اور سفاک لہجہ تھا۔ یہ ملے تھا کہ کہنے والا اپنی بات پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے۔ وہ جملہ سن کر عمران کے روٹنے کھڑے ہو گئے تھے اور جسم میں سنسنی دوڑنے لگی تھی۔

اس نے ریسیور کان سے چپکا لیا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی، لائن بالکل صاف اور آوازیں بالکل واضح تھیں۔

”اور اس کے بعد پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔“ لڑکی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ آواز سے وہ عورت نہیں، لڑکی ہی لگ رہی تھی۔ ”اس سے تمہیں یا مجھے کیا ملے گا، کچھ بھی نہیں۔“ ”تو پھر میں کیا کروں؟“ مرد نے بے بسی سے کہا۔ ”میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ مجھے تو تم پر بھی اعتبار نہیں رہا۔“

”کیوں، میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ ”تم میری بات کیوں نہیں مانتیں۔ تم گھر چھوڑ کر چلی آؤ، عاقل و بالغ ہو۔ ہم خاموشی سے، سادگی سے شادی کر لیں گے۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“ ”مگر ہمیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ وہ بھی نہیں جو میرا حق ہے۔“

”میرا خیال تھا، تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ مرد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”محبت تو نفع نقصان کو نہیں دیکھتی۔“

”پھر محبت مفلسی اور بد حالی کے ہاتھوں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ محبت کرنے والے ایک دوسرے سے نفرت بھی کرنے لگتے ہیں۔“ لڑکی کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ ”میں اپنا حق لے کر تمہارے ساتھ گھر بسانا چاہتی ہوں۔“

”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ تمہارا باپ یہ کب چاہے گا، میں اس کا خون سہی، ہوں تو نیکی ڈرا سیور۔ حالانکہ اب یلو کیب تو بہت پڑھے لکھے، بڑے خاندانی لوگ بھی چلا رہے ہیں۔“

”میں مانتی ہوں کہ یہ زیادتی ہے مگر میں وعدہ کرتی ہوں کہ تلافی کروں گی اس کی۔ تم چاہتے کیا ہو؟“

”تم جانتی ہو۔ میں تم سے دور نہیں رہنا چاہتا۔“ مرد کا لہجہ اچانک ہی بدل گیا، اب وہ گھگھایا رہا تھا۔ ”میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ تم مجھ سے دور نہیں رہو گے۔ تم مجھ سے مل

”سکونے.....“
”کیسے؟“

”میں نے واضح کر دیا ہے کہ میں شادی کے بعد اپنے گھر میں رہوں گی۔ سسرال والوں کے ساتھ نہیں۔“

اس وقت آئینہ سامنے ہوتا تو عمران اپنے چہرے کا تاثر دیکھ کر خود بھی حیران رہ جاتا پھر بھی اسے اندازہ تھا کہ اسے بہت بڑا شاک لگا ہے۔ یہ تو لگتا تھا کہ گفتگو اسی کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس نے کوشش کر کے خود کو سنبھالا اور وہ گفتگو زیادہ توجہ سے سننے لگا۔
”مجھے اس طرح کی مراعات کی ضرورت نہیں۔“ مرد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”مجھے تمہاری ضرورت ہے۔“

”وہی تو میں کہہ ہوں کہ میں ملتی رہوں گی تم سے۔“
”میں برداشت نہیں کر سکتا کہ تم کسی اور کی بن کر رہو۔“

لڑکی اترانے کے انداز میں ہنسی۔ ”سچ..... بہت جیلں ہو۔“ پھر وہ سنجیدہ ہو گئی۔
”چلو، تمہاری خاطر میں یہ کوشش بھی کر لوں گی کہ اپنے شوہر کو قریب نہ آنے دوں۔ تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔“

”مجھے بچوں کی طرح ثانی دے کر مت بھلاؤ۔ میں تمہیں قانونی طور پر اور ہمیشہ کے لیے اپنا نا چاہتا ہوں۔ میں پھر یہی کہوں گا کہ تم سب کچھ چھوڑ دو اور مجھ سے شادی کرلو۔ مجھے تمہارے باپ کی دولت اور جائیداد سے کوئی دلچسپی نہیں۔“
”تمہیں نہیں، مجھے تو ہے۔“ لڑکی نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میری خاطر تھوڑے عرصے..... صبر کرلو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔“

”میں اپنے کام خود نمٹانے کا عادی ہوں۔ جو میں چاہتا ہوں وہ تم نہیں کر سکتیں تو پھر سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ کوئی شخص زیادہ دن تمہارا شوہر نہیں رہ سکتا۔“

مرد کا لہجہ بے حد خوف ناک تھا۔ عمران کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ریسپور اس کے ہاتھ سے یوں چپکا ہوا تھا جیسے اب اس گرفت سے کبھی آزاد نہیں ہو سکے گا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ لڑکی کے لہجے میں خوف تھا۔

”مطلب تم خوب سمجھ رہی ہو لیکن بیوہ ہو جانے کا تصور تمہارے لیے خوش گوار تو

نہیں ہو سکتا۔“

”میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ اس طرح تمہیں بھی کھو بیٹھوں گی۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ اس شادی میں میری خوشی تو شامل نہیں ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔ میں ایسی ترکیب کروں گا کہ سانپ بھی مرجائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔“ مرد کے لہجے میں وہی سرد مہری تھی جس نے عمران کو یہ گفتگو سننے پر مجبور کیا تھا۔ ”تم نے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کر کے میرا کام آسان کر دیا ہے۔“
”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟“

”آج کل شہر میں ڈکیتیاں بہت ہو رہی ہیں۔ ڈاکو ذرا سی مزاحمت پر اہل خانہ کو ہلاک بھی کر دیتے ہیں۔“ مرد کا لہجہ ٹھنڈا دینے والا تھا۔

لڑکی کا رد عمل سامنے نہیں آسکا۔ وہ گہرائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”میں فون رکھ رہی ہوں، کوئی اوپر آ رہا ہے۔“

”ایک منٹ..... اب کب بات ہوگی؟“

”اب تو مشکل ہے، کل تو گھر مہمانوں سے بھر جائے گا۔“

”تو پھر تم سے تمہارے نئے گھر میں ہی ملاقات ہوگی..... ڈکیتی کی واردات کے دوران۔ اچھا..... خدا حافظ ثینہ۔“

ثینہ!..... ثینہ!..... ثینہ!.....

اسے خود کو سنبھالنے میں بہت دیر لگی جو گفتگو اس نے سنی تھی اس پر غور کرنے اس کا تجزیہ کرنے کی اس میں بالکل سکت نہیں تھی۔ اس حد تک سنبھلنے میں تو شاید بہت دیر لگتی۔ البتہ اسے یہ ضرور یاد تھا کہ وہ وحید کے گھر فون کرنا چاہتا تھا۔

اس بار نمبر ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ فون وحید کے چھوٹے بھائی نے ریسپو کیا تھا۔

”میں عمران بول رہا ہوں۔ ذرا وحید سے بات کراؤ۔“ اس نے مضمل لہجے میں کہا۔
”بھائی جان تو گھر سے نکل چکے ہیں۔ آپ کے دفتر جانے کا کہہ رہے تھے۔“

”ٹھیک ہے۔ شکریہ۔“

ریسپور رکھنے کے بعد عمران اٹھا اور بیرونی کمرے میں گیا۔ ”مس شاہدہ، آپ چھٹی کر سکتی ہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر اور رکوں گا۔“

”شکریہ سر۔“

”شادی میں ضرور آئیے گا۔“

”ضرور سر۔“

شاہدہ چلی گئی۔ عمران اپنی میز پر آ بیٹھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔

ایک عام سا خوش گوار دن کیسے انجام کو پہنچ رہا تھا!

☆=====☆=====☆

وہ آدھے گھنٹے تک اسی طرح بیٹھا رہا..... سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے، جبکہ اس کے لیے کچھ سوچنا سمجھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وجود میں وہی سانے تیر رہے تھے، جو ٹیلی فون کی لائن سے اس کے دل اور دماغ میں اتر آئے تھے۔

بالآخر وحید نے ہی اسے چونکایا۔

”ارے بھائی، کہاں کھوئے ہوئے ہو؟“ وحید نے کہا۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے میں وحید کھڑا تھا۔ اس نے کچھ کہا بھی تھا لیکن عمران اس کی آواز سن کر چونکا تھا۔ لفظ وہ ایک بھی نہیں سن سکا تھا۔ ”او وحید کب آئے تم، بہت انتظار کرایا.....“

وحید کمرے میں آگیا۔ ”لگتا تو نہیں کہ تم میرا انتظار کر رہے تھے۔“ اس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”دروازے میں کھڑے ہو کر تین بار آواز دی ہے تمہیں لیکن تمہیں تو ہوش ہی نہیں تھا۔“

”بس ذرا تھک گیا ہوں۔“ عمران نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے تو لگتا ہے، جاگتی آنکھوں خواب دیکھنے لگے ہو۔“ وحید نے مسکراتے ہوئے کہا پھر فوراً ہی تردید کی ”سوری..... جاگتی آنکھوں تو تم ہمیشہ خواب دیکھتے ہو۔ آج شاید سو گئے تھے۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”تردید کی کوئی ضرورت نہیں، اب صرف پانچ چھ دن کی تو بات ہے۔“ وحید نے

معنی خیز لہجے میں کہا۔

”یہ بات نہیں۔“

وحید نے اس بار اسے غور سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ اتنی دیر میں عمران خود کو سنبھال چکا تھا۔ ”کچھ نہیں یار۔ کوفت کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تمہارے دفتر فون کیا تو پتا چلا کہ تم ایک بجے جا چکے ہو، گھر کا نمبر ٹرائی کرتا رہا۔ لائن کراس ہونے کی وجہ سے نمبر نہیں ملا۔ نمبر ملا تو پتا چلا کہ تم یہاں کے لیے نکل چکے ہو پھر انتظار کی کوفت.....“

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”بس سوٹ کی ٹرائی دینی ہے۔“

”تو چلو۔“

دونوں دفتر سے نکل آئے۔

وہ دن ہی شاید کچھ عجیب تھا۔ ٹیلر ماسٹر نے معذرت خواہانہ لہجے میں عمران سے کہا ”معاف کیجئے گا سر۔ میں شرمندہ ہوں لیکن ایک کاریگر کے چھٹی کر لینے کی وجہ سے گزبڑ ہو گئی پلیز..... اگر آپ ایک گھنٹے کے بعد تشریف لائیں تو میں ٹرائی لے لوں گا۔“

اب انہیں وقت گزاری بھی کرنا تھی۔ جبکہ عمران جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ آرام کا خیال تو دل سے نکل گیا تھا۔ وہ اس گفتگو پر غور کرنا چاہتا تھا جو اس نے اتفاقاً فون پر سنی تھی۔ کچھ الجھنیں تھیں۔ جنہیں وہ دور کرنا چاہتا تھا۔

وہ ایک ریسٹورنٹ میں چلے آئے۔ عمران کا ذہن بدستور اس گفتگو میں الجھا ہوا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ وحید سے اس سلسلے میں بات کی جاسکتی ہے..... اور اگر کی جاسکتی ہے تو کس حد تک؟ اس کا جواب کچھ مشکل نہیں تھا۔ وہ وحید کو اس گفتگو کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ ورنہ وہ اس کا مذاق اڑاتا کہ وہ خواہ مخواہ وابستہ پالتا پھرتا ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی ہونے والی بیوی کو اپنے دوست کی نظروں میں حقیر بھی کر سکتا تھا۔ یہ سراسر خسارے کا سودا تھا۔

ویٹر چائے رکھ گیا تھا۔ وحید نے چائے بنا کر پیالی اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ اس نے چائے کا گھونٹ لینے کی کوشش کی مگر اس کے ہونٹ جل گئے۔ چائے بہت گرم تھی۔

”کیا بات ہے۔ ابھی تک کھوئے ہوئے ہو؟ یا کوئی پریشانی ہے؟“ اس بار وحید کے

لجے میں فکر مندی تھی۔

”نہیں تو بس ایک بات پر غور کر رہا ہوں۔“ عمران نے کہا۔ ”یار ایک بات بتاؤ۔ یہ جو کراس لائن پر گفتگو ہوتی ہے، ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کس نمبر سے کس نمبر پر گفتگو ہو رہی ہے؟“

”کیوں۔ آج ایسا کوئی تجربہ ہوا ہے؟“

”ہاں۔ تمہیں فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت لائن کراس ہو رہی تھی۔“

”کوئی دلچسپ بات ہوگی۔“

”نہیں۔“ عمران نے جلدی سے کہا۔ ”عام سی گفتگو تھی۔“

”تو پھر اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟“ وحید نے جرح کی۔

”مجھے خیال آیا کہ کبھی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم فون پر کوئی بہت حساس نوعیت کی گفتگو سن لیں۔ مثلاً کوئی کسی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہو۔ تو ایسے میں اتفاقاً گفتگو سننے والے پر بھی ذمے داری تو عائد ہوگی نا۔“

وحید نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ عمران کچھ چھپا رہا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عمران بے حد تخیل پسند ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عام سی گفتگو نے اس کی قوت متخیلہ کو ممیز کر دیا ہو اور یہ بھی درست تھا کہ ایسی یا کسی اور طرح کی حساس گفتگو کوئی کسی بھی وقت سن سکتا ہے۔ اس لیے کہ لائنیں تو ہر روز سیکڑوں ہزاروں باز کراس ہوتی ہیں۔ ”ہاں“ یہ ممکن ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن اس کا ایک آسان حل ہے۔ اخلاق بھی ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ اگر فون کرتے وقت کبھی ایسا ہو تو فوراً ریسیور رکھ دینا چاہیے۔“

اس وقت تک عمران پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ اس کا تخیلاتی ذہن اب پوری طرح کام کر رہا تھا۔ ”یہ کتنا بہت آسان ہے۔“ وہ بولا۔ ”فرض کرو، تم کسی کو فون کر رہے ہو اور لائن کراس ہو جاتی ہے۔ تمہارے اس بات کو سمجھنے اور ریسیور رکھنے سے پہلے یہ جملہ تمہارے کانوں میں پڑ جاتا ہے کہ..... بس اسے قتل کر دو۔ اب بتاؤ، تم کیا کرو گے؟“

”میں اخلاقیات کا پاس کرتے ہوئے ریسیور رکھ دوں گا۔“ وحید نے بے حد اطمینان سے کہا۔

”کیوں۔ یہ تمہاری اخلاقی ذمے داری نہیں ہوگی کہ تم وہ گفتگو سنو۔ یہ جاننے کی کوشش کرو کہ کون کسے قتل کرنا چاہتا ہے اور اس کے بعد پولیس کو مطلع کرو۔ اس واردات کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ اس لیے کہ یہ انسانی جان کا معاملہ ہے۔ ورنہ عمر بھر اپنے ضمیر پر بوجھ لیے پھرو گے۔ بلکہ وہ خون تمہارے سر بھی ہوگا۔“

”واقعی یار، یہ بات تو ہے۔“ وحید نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”اب تو میں یہ دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے۔ ہمارے ہاں تو پولیس اطلاع دینے والے ہی کو قاتل فرض کر کے تفتیش کا آغاز کرتی ہے۔ ویسے یار عمران، تم ایڈورٹائزنگ کو چھوڑو، جاسوسی کہانیاں لکھنی شروع کر دو۔ تمہلکے مچادو گے خدا کی قسم۔“

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ عمران نے خشک لہجے میں اسے یاد دلایا۔

”ارے ہاں۔ وہ تو بات ہی بہت پیچھے رہ گئی۔ میرا خیال ہے، یہ تو ٹریس نہیں کیا جاسکتا کہ کس نمبر سے کس نمبر پر کال ہو رہی ہے۔“ وحید نے کہا۔ ”ہاں، اگر اسی وقت ایکیچینج سے رابطہ کیا جائے تو یہ بات معلوم بھی ہو سکتی ہے مگر وہ قانوناً ایسا کر نہیں سکتے۔ میرے تمہارے کہنے پر تو وہ ایسا کریں گے نہیں۔ لہذا عملاً یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ کال ختم ہو جانے کے بعد نمبر ٹریس کیے جاسکتے.....“ وہ کتے کتے رکا۔ ”ہاں، اس حد تک تو ویسے بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ کون سے ایکیچینج کی کال ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم مجھے فون کر رہے ہو۔ اس دوران لائن کراس ہو اور آپ گفتگو سنیں تو ایک نمبر گلشن اقبال ایکیچینج کا ہوگا۔ یا تو اس ایکیچینج سے کال کی گئی ہوگی یا کال اس ایکیچینج میں ریسیو کی گئی ہوگی۔ اس سے زیادہ تو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔“

عمران نے بہت کوشش کر کے اپنا چہرہ بے تاثر رکھا۔ وحید اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ عمران نے گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

بل ادا کر کے وہ نکل آئے۔ پندرہ منٹ بعد وہ فارغ ہو چکے تھے۔ عمران اب پرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے کراس ٹاک کے بارے میں وحید سے جو گفتگو کی تھی اس کے بعد وہ ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ ایسا ہوتا ہے کسی مسئلے پر بات چیت نہ کی جائے تو وہ بہت بڑا بہت سنگین لگنے لگتا ہے اور گفتگو کر لی جائے تو بڑے سے بڑے مسئلے کی سنگینی کم ہو جاتی ہے۔

عمران نے بھی اسے غیر متعلق اور غیر اہم قرار دے کر ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

☆=====☆

مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا!

وہ لوگ رات کے کھانے کے بعد بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے، اچانک اطلاعی گھنٹی بجی۔ فرزانہ دروازہ کھولنے کے لیے گئی۔ اس کی گھنٹی گھنٹی چیخ سن کر عمران کو گز بڑکا احساس ہوا۔ وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں چار مسلح افراد اندر گھس آئے۔ چروں پر انہوں نے ڈھائے باندھ رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر سب کے چروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”آپ لوگوں کے لیے بہتر یہی ہو گا کہ ہم سے تعاون کریں۔“ اس سیاہ پوش نے کہا، جو سب سے آگے تھا اور سرغنہ لگ رہا تھا۔ ”ورنہ ہم لوگ تو گھرنے سے سوچ کر نکلے ہیں کہ واپسی کی کوئی ضمانت نہیں اور جو جان دینا جانتے ہوں، ان کے لیے جان لینا زیادہ آسان ہوتا ہے۔“

اس کا لہجہ مذہب لوگوں کا سا تھا۔ الفاظ وہ پڑھے لکھوں کے سے استعمال کر رہا تھا۔ عمران سوچنے لگا کہ روزگار کی خوف ناک کمی کی وجہ سے یہ نوبت آگئی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی ڈاکو بن گئے ہیں۔

”ہم ان چیزوں کو ترجیح دیں گے جو چھوٹی اور بیش قیمت ہوں۔ زیادہ جگہ نہ گھیرتی ہوں۔“ ڈاکوؤں کا سرغنہ یوں کہہ رہا تھا جیسے کسی کاروباری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اپنی ترجیحات بیان کر رہا ہو۔ ”مثلاً زیورات۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”اور نقدی جتنی بھی ہو، چلے گی۔ اب ذرا جلدی کریں۔ پلیز خاتون، آپ میرے ساتھ آئیں۔“ اس نے دروازہ بیگم سے کہا۔ ”اس گھر میں کرتا دھرتا آپ ہی معلوم ہوتی ہیں۔“

اسی وقت عمران کو بہن کا خیال آگیا۔ دروازہ کھولنے گئی تھی لیکن واپس نہیں آئی تھی۔ ”ایک منٹ۔“ اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”امی رک جائیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میری بہن کہاں ہے؟“ اس نے سرغنہ سے پوچھا۔

”شاید تم اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے ہو جس نے دروازہ کھولا تھا۔“ سرغنہ نے کہا۔ ”وہ بے ہوش ہو گئی تھی، وہیں پڑی ہے۔“

”تم نے کوئی زیادتی کی ہے اس کے ساتھ؟“ عرفان غرایا۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ ایاز صاحب نے سختی سے اس کا بازو تھام لیا۔

”زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں نوجوان۔“ سرغنہ نے ناصحانہ انداز میں کہا ”اگر وہ بے ہوش نہ ہوتی تو پورے گھر کے لیے مصیبت بن جاتی۔ ہم کسی کی چیخ و پکار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خاموشی اور سکون سے کام ہو جائے تو یہ تم لوگوں کے حق میں بھی بہتر ہی ہو گا۔ آئیے خاتون میرے ساتھ۔“ وہ دروازہ بیگم کی طرف مڑا۔

عمران آگے بڑھا۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔

”ارے..... تم کہاں جا رہے ہو؟“ سرغنہ نے درشت لہجے میں اسے ٹوکا۔

”اپنی بہن کو یہاں لے کر آؤں گا۔“ عمران نے رمان سے کہا۔

”تم اس کے ساتھ جاؤ۔“ سرغنہ نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”کوئی گزبوند نہ کرنے پائے۔“

عمران دروازے کی طرف گیا۔ فرزانہ دروازے کے پاس بکھری پڑی تھی۔ عمران نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے بہن کو ٹولا لیکن وہ زخمی نہیں تھی۔ کم از کم خون تو نہیں نظر آ رہا تھا۔ اس نے بہن کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور ٹی وی لائونج میں لا کر کاؤچ پر لٹا دیا اور اس کے جسم کو چادر سے ڈھانپ دیا پھر اس نے سرگھا کر دیکھا۔ امی موجود نہیں تھیں اور ڈاکوؤں کا سرغنہ بھی غائب تھا۔

”امی کہاں ہیں ابو؟“ اس نے ایاز صاحب سے پوچھا۔

ایاز صاحب نے سر ہلا کر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ عمران اس طرف جانا چاہتا تھا کہ ایک ڈاکو نے ریوالور نکال لیا۔ ”مسٹر، زیادہ ہیرو بننے کی ضرورت نہیں۔ سکون سے بیٹھ جاؤ تاکہ ہم جلد رخصت ہو سکیں۔ تمہاری جان بھی چھوٹے اور ہماری بھی۔ اب حرکت کرو گے تو.....“ اس نے خوف ناک انداز میں ریوالو لہرایا۔ عمران صوفے پر بیٹھ گیا۔ سچ یہ ہے کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اب تک یہ سب کچھ اسے غیر حقیقی لگ رہا تھا لیکن ریوالور دیکھنے کے بعد اس نے اس سنگین حقیقت کو پوری طرح تسلیم کر لیا تھا۔

سرغنہ تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی پوٹلی تھی جس میں شاید نقد رقم اور زیورات تھیں۔ دروازہ بیگم کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ لگتا تھا وہ خواب کے عالم میں چل رہی ہیں۔ وہ آتے ہی صوفے پر ڈھیر ہو گئیں۔

سرغنہ نے پوٹلی اپنے ایک ساتھی کو دی اور عمران کے قریب آگیا۔ ”کھڑے ہو جاؤ اور مجھے اپنے کمرے میں لے چلو۔“

”کک..... کیوں..... کیا بات ہے؟“ عمران گھبرایا ہوا تھا۔ اس فرمائش پر اور گھبرا گیا ”میرے کمرے میں تو کوئی قیمتی چیز نہیں۔“

”قیمتی نہ سہی، میرے مطلب کی ایک چیز ہے تمہارے کمرے میں، چلو۔“
عمران جیسے تیسے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگوں کی کپکپاہٹ اور بڑھ گئی تھی۔ ”اسے کیوں لے جا رہے ہو؟“ دردانہ بیگم نے فریاد کی۔

عرفان اور فرحان نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اب تینوں ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آرہے تھے۔ ایاز صاحب نے دونوں کے ہاتھ تھام لیے۔ ”خدا کے لیے..... ہوش سے کام لو۔“ وہ بڑبڑائے۔

”چلو“ سرغنہ نے زہریلے لہجے میں عمران سے کہا۔ عمران لرزتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

کمرے میں پہنچ کر سرغنہ نے عمران سے کہا۔ ”اب سکون سے بیٹھ جاؤ۔“
عمران کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔
”یہی بتانے کے لیے تو یہاں لایا ہوں تمہیں۔“ سرغنہ نے کہا اور چہرے سے ڈھانٹا ہٹا دیا۔ ”غور سے دیکھ لو مجھے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے قاتل کی صورت بھی نہ دیکھ سکو۔ میں تمہیں اتنی بڑی محرومی نہیں دے سکتا۔“

عمران نے غور سے اسے دیکھا لیکن وہ اجنبی چہرہ تھا۔ اس نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ اچانک اس کے الجھے ہوئے ذہن پر سرغنہ کے جملے کی معنویت روشن ہوئی۔
اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ”کیا..... کیا تم..... مجھے مار دو گے؟“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں“ بتا رہا ہوں، اسی لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔“
”لیکن کیوں؟ جو کچھ تمہیں چاہیے، وہ تو تمہیں مل چکا ہے۔“
سرغنہ نے ریوالور نکالا اور اس پر تان لیا۔ ”اصل چیز تو نہیں ملی۔ وہ اب ملے گی، بس اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”مگر میرا قصور کیا ہے؟“
ٹریگر پر سرغنہ کی انگلی کا دباؤ بتدریج بڑھ رہا تھا۔ ”تمہارا قصور یہ ہے کہ تم ثمنہ سے شادی کر رہے ہو۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میری ثمنہ سے۔“ اتنا کہہ کر اس

نے ٹریگر دیا دیا۔ فائر کی آواز کمرے میں گونجی پھر جیسے سب کچھ اندھیروں میں ڈوب گیا۔
عمران اٹھ کر بیٹھا تو اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا اور اس پر لرزہ طاری تھا۔ اس کے کانوں میں اپنی چیخ مسلسل گونج رہی تھی۔ دیر تک وہ ساکت بیٹھا جسم کے لرزے پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے اٹھ کر لائٹ آن کی۔ اس کے ہاتھوں میں اب بھی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

دیر تک وہ اپنی اعصاب زدگی پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے اٹھ کر پانی پیا اور دوبارہ لیٹ کر سونے کی کوشش کی مگر آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ سو نہیں سکتا۔

ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ وہ سوچ سکتا لیکن جب آدمی خواہش کے باوجود سو نہ سکے تو سوچنے سے بچ بھی نہیں سکتا۔ سوچیں ذہن پر بری طرح یلغار کر دیتی ہیں۔ ایسے میں آدمی معقولیت کے اعتبار سے توازن بھی کھو بیٹھتا ہے۔ عمران کو احساس تھا کہ اس وقت اس کی سمجھ بوجھ قابل اعتماد نہیں ہے۔ وہ سوچوں سے بچنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے کسی بگولے کی طرح اس کے ذہن کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں بس ایک نام چکرا رہا تھا..... ثمنہ! اتنا اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ شام کو وحید سے گفتگو کرنے کے بعد جو وہ پرسکون ہوا تھا، وہ محض سطح پر تھا۔ شعوری طور پر وہ ہلکا پھلکا ہو گیا تھا لیکن اس کی تشویش تحت الشعور میں منتقل ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ اس خواب کی شکل میں نکلا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا..... اور وہ یہ کہ اسے ثمنہ سے شادی سے انکار کر دینا چاہیے۔ خواب میں ڈاکوؤں کے سرغنہ نے اس پر فائر کرنے سے پہلے اس کا یہی قصور بتایا تھا..... تم ثمنہ سے شادی کر رہے ہو..... میری ثمنہ سے! اس کا نیند اور خوف سے شل ذہن اسے بتا رہا تھا کہ وہ خواب اس کے لیے ایک تنبیہ ہے۔ اگر اس نے ثمنہ سے شادی کی تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس کی توقع کے خلاف اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرنے لگا۔ دھند چھنے لگی۔

اب وہ بہتر طور پر سوچ سکتا تھا اور تجزیہ بھی کر سکتا تھا۔
فون پر اتفاقہ سنی جانے والی گفتگو کو اس نے اپنی صورت حال پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے اس کے پاس معقول دلیلیں تھیں کہ یہ ثمنہ وہ ثمنہ ہو سکتی

ہے، جس سے اس کی شادی ہو رہی ہے۔

پہلی دلیل یہ تھی کہ فون پر جس لڑکی سے گفتگو کی جا رہی تھی، اس کا نام ثینہ تھا۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ اس فون والی ثینہ کی بھی شادی ہو رہی تھی۔ اس نے مرد کو بتایا تھا کہ اب وہ فون نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ اگلے روز سے گھر میں مہمانوں کا ہجوم ہو گا۔ جبکہ عمران کی ہونے والی بیوی ثینہ اگلے روز مایوں بیٹھ رہی تھی اور وہاں بھی مہمانوں کا ہجوم ہو جائے گا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ فون کرنے والی ثینہ نے مایوں کا حوالہ نہیں دیا تھا۔

تیسری دلیل یہ تھی کہ فون کرنے والی ثینہ بھی اس کی ثینہ کی طرح گلشن اقبال میں رہتی تھی۔

چوتھی دلیل یہ تھی کہ فون کرنے والی ثینہ نے بھی اس کی ثینہ کی طرح سسرال سے علیحدہ اور شوہر کے ساتھ تمار بننے کی شرط عائد کی تھی۔

عمران کا ذہن اب پوری طرح جاگ رہا تھا۔ اس نے ان چاروں دلیلوں پر دوبارہ غور کیا۔ تیسری دلیل ذرا کمزور تھی۔ اس بات کا امکان پچاس فی صد تھا کہ فون کرنے والی ثینہ گلشن اقبال میں رہتی ہوگی۔ پہلی بار اس نے یہ بات نظر انداز کر دی تھی کہ یہ ثینہ کے گلشن اقبال میں رہنے کا نتیجہ حتمی نہیں ہے۔ اس کی تصدیق بھی کسی طرح سے نہیں کی جاسکتی۔ یہ امکان بھی موجود ہے کہ دوسرا فریق یعنی مرد گلشن اقبال میں رہتا ہو یا وہاں سے فون کر رہا ہو۔

اس تیسری دلیل سے قطع نظر باقی دلیلیں بہت مضبوط تھیں۔

اب اس نے تصویر کو دوسرے رخ سے دیکھنے کی کوشش کی۔ جوانی دلیل صرف ایک تھی۔ یہ سب کچھ محض اتفاق ہے۔ ثینہ نام کی لڑکیاں شہر میں جانے لگتی ہوں گی۔ سو دوسو تو گلشن اقبال میں بھی رہتی ہوں گی۔ اس نے اپنے زور تخیل سے بات کو کہیں کا کہیں پہنچا دیا تھا۔

عمران اپنے زور تخیل سے خوب آگاہ تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس معاملے میں اس کے تخیل کا کوئی دخل نہیں۔ وہ کراس ٹاک تو حقیقت تھی اور اس نے اس میں کوئی رنگ آمیزی بھی نہیں کی تھی۔ جو اس نے سنا تھا، صرف اسی کی بنیاد پر سوچ رہا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اتفاقات اگر زنجیر کی کڑیوں کی طرح سے ملنا شروع ہو جائیں تو کوئی نہ کوئی بات

ضرور رونما ہوتی ہے۔ اتفاقات بھی بے سبب نہیں ہوتے۔

تو پھر نتیجہ کیا نکلا؟

تجزیہ یہ بتاتا تھا کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ فون پر اس کی ہونے والی بیوی ثینہ ہی بات کر رہی تھی لیکن اس پر حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ قتل کے اس مقدمے کی طرح کا معاملہ تھا جس میں ٹھوس شواہد موجود نہ ہوں، کوئی یقینی گواہ نہ ہو۔ البتہ واقعاتی شہادتیں مضبوط ہوں لیکن ان کی بنیاد پر ملزم کو سزائے موت تو نہیں سنائی جاسکتی۔ لیکن یہاں بات قانون ضرورت کی بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی کو سنگین خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خطرے سے بچا جائے لیکن کیسے؟ شادی سے انکار کر دے؟

اب یہ معاملہ منطقی تجزیے کا نہیں، عملی نوعیت کا تھا۔ بات اتنی بڑھ چکی تھی کہ اب وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے بھی یہ معیوب اور گری ہوئی حرکت تھی۔ اتنا آگے جانے کے بعد اگر لڑکا شادی سے انکار کرے تو لڑکی کی رسوائی ہوتی ہے اور اس کی زندگی برباد ہو جاتی ہے.....

لیکن یہاں یہ امکان بھی موجود تھا کہ لڑکی کی زندگی سنور جائے گی۔ اس کے ذہن نے دلیل دی۔ رسوائی کی وجہ سے لڑکی کے والدین اس کی شادی وہاں کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، جہاں وہ چاہتی ہے، جہاں وہ نہیں چاہتے۔

مگر یہ صرف اس صورت میں ہی درست ہو سکتا تھا، جب اس کا یہ مفروضہ حقیقت پر مبنی ہو کہ جس ثینہ کی گفتگو اس نے فون پر مٹی تھی، وہی اس کی ہونے والی بیوی ہے اور یہ کوئی یقینی بات نہیں۔ ذہن نے خود ہی اپنی دی ہوئی دلیل کو مسترد کر دیا۔

تو پھر؟

وہ شادی سے انکار کرے گا تو ابو اور امی اس سے وجہ ضرور پوچھیں گے۔ وجہ بتا نہیں سکتا۔ اس صورت میں یہ امکان رہے گا کہ وہ بہتان تراشی کا مرتکب ہو رہا ہے جو اللہ کو ناپسند ہے خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ کسی شریف لڑکی کے لیے تباہ کن بھی ثابت ہو سکتا ہے پھر وجہ بتانے کی صورت میں امی اور ابو اس کا مذاق اڑائیں گے..... ناراض بھی ہوں گے۔ بات ہے بھی مضحکہ خیز۔ اور وجہ نہ بتائے تو امی اور ابو یقیناً اس سے خفا ہو جائیں گے کہ وہ سب کچھ انہیں سوچنے کے بعد اس مرحلے پر پیچھے ہٹا رہا ہے کہ

وہ اپنے سہیلیوں کے سامنے شرمندہ ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

بافرض وہ امی اور ابو کی ناراضی کا خطرہ مول لیتے ہوئے شادی سے انکار کر دیتا ہے تو انیس الرحمن کا سامنا کیسے کرے گا۔ ان کی بیٹی کی بے ہودہ شرط کے جواب میں اس نے خود بھی ایک شرط عائد کر دی تھی اور انہوں نے وہ شرط ہمیں خوشی پوری کر دی تھی..... اور وہ بھی بڑی شان سے۔ فلیٹ انہوں نے اسی کے نام سے خریدا تھا۔ شرط پوری کروانے کے بعد انکار کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی اور صرف زبانی معاملہ بھی نہیں تھا۔ انیس صاحب نے اس کا عملی ثبوت بھی دیا تھا۔ فلیٹ اس کے نام تھا۔ کار اس کے نام تھی۔ اس کے بینک اکاؤنٹ میں انہوں نے دس لاکھ روپے جمع کرادیئے تھے اور فلیٹ کے کاغذات دیکھنے کے بعد جب اس نے اشار بنایا کہ کہا تھا کہ بات بگڑنے کی صورت میں الجھن ہوگی تو انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ یہ غیر مشروط ہے۔ ایک بیٹے کے لیے باپ کا تحفہ ہے۔ بغیر کسے انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ کسی خرابی کی صورت میں وہ اسے واپس لینا بھی نہیں چاہیں گے۔

یعنی وہ شادی سے انکار کر دیتا تب بھی انیس صاحب قانونی طور پر اس سے کوئی چیز واپس نہیں لے سکتے تھے لیکن ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی تو وہ قانونی طور پر اپنے لیے گنجائش رکھ سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں اپنے تحفے واپس نہ لیتے۔ البتہ ان تحفوں کی وجہ سے باپ بیٹے کے رشتے کے حوالے سے وہ اس سے انکار کی وجہ پوچھنے کا حق رکھتے تھے اور اس صورت میں وہ انہیں کیا بتاتا؟ یہ ٹیلی فونک طلسم ہوش رہا؟

پھر سب سے بڑا مسئلہ اس کا اپنا تھا..... اپنے ضمیر کا!

اگر وہ امی ابو کی ناراضی کی پروا کیے بغیر انکار کر دے اور انیس صاحب کا دل دکھانے کی بھی پروا نہ کرے تو انیس صاحب کے دیئے ہوئے تحفوں کا کیا کرے گا؟ کیا وہ ان تحفوں کے ساتھ خوش رہ سکے گا؟ ہرگز نہیں۔ کیا وہ ان تحفوں سے جان چھڑا سکے گا؟ یہ یقینی نہیں۔ وہ فرض کر سکتا ہے کہ انکار کے بعد وہ انیس صاحب کو یہ سب کچھ لوٹا دے گا..... اور وہ اسے قبول بھی کر لیں گے لیکن اگر انہوں نے دی ہوئی چیزیں واپس لینے سے انکار کر دیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو جیتے جی مرجائے گا۔ شرمندگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

منطقی طور پر اس بات کا امکان تھا کہ انیس صاحب وہ سب کچھ واپس لینا قبول

کر لیں گے لیکن یہ منطق کا پر شیخ کا اور امکان کا معاملہ نہیں تھا۔ اس معاملے میں وہ ۹۹ فی صد امکان پر بھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ جبکہ یہاں تو امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ انیس صاحب کی شخصیت ان کا مزاج بتاتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے انحراف کرنا پسند نہیں کریں گے۔ یہ تو ان کے لیے بے عزتی کی بات ہوتی..... اور وہ ایسے آدمی نہیں لگتے تھے جو بے عزتی گوارا کرے۔

آخر میں عمران ایاز اس نتیجے پر پہنچا کہ شادی سے انکار بھیانک غلطی ہوگا اور یہ وہ نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر اسے یقین ہوتا کہ انیس صاحب اس سے وہ سب کچھ واپس لے لیں گے تو شاید وہ انکار کر دیتا حالانکہ یہ بھی مشکل ہی ہوتا۔ انیس صاحب اسے بہت اچھے لگے تھے..... شفیق باپ کی طرح۔ ان کا دل دکھانے کی ہمت وہ کہاں سے لاتا؟

تو گویا انکار کی گنجائش نہیں تھی تو پھر؟

اس ”تو پھر“ پر غور کرتے کرتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆=====☆=====☆

اس کی آنکھ کھلی تو سوا گیارہ بج چکے تھے! وہ امی کا احسان مند تھا کہ انہوں نے اسے آرام کرنے کا موقع فراہم کیا۔ ورنہ عام طور پر چھٹی والے دن بھی وہ اتنی دیر سے نہیں اٹھتا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھا تو اسے رات کا خواب یاد آیا پھر اپنی کیفیت اور اپنا تجربہ بھی یاد آیا لیکن یہ سب کچھ بہت دور کا لگ رہا تھا..... افسانہ سا۔ اسے سنگینی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ بلکہ اپنی رات کی پریشانی بھی مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا ہوتا ہے۔ خاص طور پر رات کا ڈراؤنا خواب دیکھنے کے بعد آدمی کا بُرا حال ہوتا ہے۔

رات کی تاریکی میں سب کچھ خوفناک لگتا ہے۔ اس سے آدمی کی سوچ بھی متاثر ہوتی ہے۔ خواب کا ڈراؤنا تاثر بھی نیند کے مارے ذہن پر نقش ہوتا ہے لیکن دن کے اجالے میں عموماً خواب اپنی اہمیت کھو بیٹھتے ہیں۔

پھر بھی دن کے اجالے میں عمران نے اس پر سوچنا ضروری سمجھا لیکن اس بار وہ صرف پندرہ منٹ میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ رات کو اتنی دہشت کے باوجود اس نے اتنے مثبت انداز میں سوچا تھا۔ اس نے رات جو کچھ سوچا تھا بالکل درست تھا۔ شادی سے انکار کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ایسی اتفاقی باتوں کا اتنا اثر لینا تو بہت

احتمالاً ہو گا کہ آدمی شادی جیسے کمٹ منٹ سے بھاگ کھڑا ہو۔ دن کے اجالے میں اسے یہ بھی یاد آیا کہ امی اور ابو اس شادی پر صرف اس لیے مصر تھے کہ لڑکی بھی انہیں بہت پسند آئی تھی اور اس کے والدین بھی اور پھر انہیں صاحب کے روپے سے امی اور ابو کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ تو پھر ٹھینہ بھی یقیناً اچھی لڑکی ہوگی۔ دیکھنے میں بھی وہ اچھا تاثر چھوڑتی تھی۔

رات کے فیصلے کی توثیق کرنے کے علاوہ عمران نے ایک فیصلہ اور کیا۔ ازدواجی زندگی ہر شخص کے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ اسے خوش گوار رکھنے کے لیے جہاں بہت سی باتوں کی اہمیت ہوتی ہے، وہاں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ باہمی اعتماد ہو۔ شک اور بدگمانی بہت نقصان دہ ہوتی ہے اور معمول مفروضوں کی بنیاد پر شک کرنا تو بہت تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ اسے بھی شک اور بدگمانی سے بچنا ہو گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کراس لائن پر جو گفتگو اس نے سنی تھی، اسے بھی خواب کی طرح بھلا دیا جائے۔..... نظر انداز کر دیا جائے۔

وہ ہاتھ روم میں داخل ہوا تو بہت مطمئن تھا۔

☆=====☆=====☆

شادی سے ایک دن پہلے وہ سب گلستان جو ہر والے فلیٹ میں چلے آئے! شادی ہوئی اور بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ دردانہ بیگم بڑے چاؤ سے ٹھینہ کو ہونا کر ”اس“ کے گھر لے آئیں۔ یہ ایک غیر معمولی صورت حال تھی۔ اس کے باوجود سب خوش تھے۔ عمران بھی بہت خوش تھا۔

ٹھینہ کی تصویر نے..... اور پھر ٹھینہ کی مختصر سی دید نے عمران پر جو اچھا تاثر چھوڑا تھا، ساگ رات کی قربت میں وہ اس سے بڑھ کر ثابت ہوئی۔ درحقیقت عمران پوری طرح اس کا اسیر ہو گیا۔ اب تو اسے اس بات سے خوف آنے لگا کہ کہیں ٹھینہ کھو نہ جائے۔ اسے بار بار یہ خیال آتا کہ کہیں یہ خواب تو نہیں؟

اگلے روز ولیمہ بھی شایان شان طریقے سے ہوا۔

شادی کے چوتھے روز دردانہ بیگم نے بیٹے اور بہو سے کہا کہ اب وہ گھر جا رہی ہیں۔ اس لیے عمران کے دل میں پھر وہ پھانس کھلنے لگی۔ ٹھینہ اتنی اچھی، اتنی پیاری سی تھی لیکن اس نے اسے اس کے گھر، محبت کرنے والے والدین سے اور بہن بھائیوں سے دور

کر دیا تھا۔ بہر حال وہ جانتا تھا کہ اب اسے اس کھٹک کے ساتھ زندگی گزارنا سیکھنا ہو گا۔ ”امی پلیز، ہمارے لیے ایک نوکرائی کا بندوبست کر دیں۔“ اس نے ماں سے کہا۔ ”اب میری چار دن کی چھٹیاں اور ہیں پھر ٹھینہ کو اکیلے رہنا ہو گا۔“ ”تم نہ بھی کہتے تو میں خود ہی اس کی فکر کرتی۔“ دردانہ بیگم نے کہا۔ ”خاص طور سے اس لیے کہ رہا ہوں امی کہ کوئی ایسی عورت ہو جو یہاں رہ بھی سکے۔ جمعرات کو ہم اسے چھٹی دے دیں گے۔ ہفتے کی صبح اسے پھر واپس آنا ہو گا۔“ ”تم بے فکر رہو بیٹے۔ یہ کام ہو جائے گا۔“

”امی..... بس تین دن میں یہ کام ہو جانا چاہیے۔“ عمران نے اصرار کیا۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں اس فرمائش کا تعلق اس کراس ٹاک سے تو نہیں لیکن اس نے ذہن سے اس خیال کو تیزی سے جھٹک دیا۔ ”میں نے کہا تھا بیٹے کہ بے فکر رہو۔“ دردانہ بیگم نے محبت سے کہا۔ ”اب میں ذرا ہو سے بات کر لوں پھر چلتی ہوں۔“

دردانہ بیگم بیڈ روم میں چلی گئیں۔ دس منٹ بعد وہ ٹھینہ کے ساتھ کمرے سے نکلیں تو بے حد خوش نظر آ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے امی؟ بہت خوش لگ رہی ہیں؟“ عمران نے پوچھا۔

”لگ نہیں رہی، میں بہت خوش ہوں۔“ دردانہ بیگم نے ہنسی کی۔

”ایسی کیا بات ہے امی؟“

”یہ ساس بہو کا معاملہ ہے۔ تمہارا اس سے کیا واسطہ؟“ دردانہ بیگم نے خوش دلی سے کہا۔

”امی..... یہ کون رشتہ درمیان میں لے آئیں آپ؟“ ٹھینہ نے دبے لہجے میں شکایت کی۔

”سوری بیٹی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔“ دردانہ بیگم نے معذرت کی۔

ٹھینہ انہیں چھوڑنے نیچے جانا چاہتی تھی لیکن دردانہ بیگم نے اجازت نہیں دی ”ابھی کچھ عرصے نئی نویلی دلہن ہی رہو۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

عمران انہیں نیچے سے رخصت کر کے آیا تو زندگی میں پہلی بار آباد گھر کے سنانے سے اس کا واسطہ پڑا۔ بلکہ یہ اسے گھر ہی نہیں لگ رہا تھا۔ یہ تو کوئی اجنبی جگہ تھی، جہاں

کوئی چیز بھی جانی پہچانی نہیں تھی، ایک عجیب سی اداسی نے اس کے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔

وہ بیداروں میں گیا، جہاں وہ بستر کی چادر بدل رہی تھی۔ ”چلے گئے سب۔“ اس نے اداسی سے کہا۔

ثمنہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، اس کی نگاہوں میں شکایت تھی۔ ”میں تو موجود ہوں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ تم تو خود موجود ہو..... اور شاید میں بھی۔“

ثمنہ کا دل اس کے لیے ڈکنے لگا۔ اس کا یہ رد عمل بالکل فطری تھا۔

عمران نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ”اچھا..... اب تم کھانے کی فکر کرو۔ گیارہ بج رہے ہیں، کچن چولہا سنبھالو اپنا۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

”امی جان کھانا پکا کر فرج میں رکھ گئی ہیں۔ کم از کم آج تو مجھے کچن میں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ ثمنہ مسکرائی۔

عمران کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔ ”ایک دن سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں تو ویسے بھی بہت شوق تھا نا کچن کا خیر..... میں اپنی اسٹڈی میں جا رہا ہوں۔ ذرا چائے بنا کر لے آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اسے دیکھے بغیر اپنی اسٹڈی کی طرف چلا گیا۔

یہ کمرہ اسے اسی طرح ملا تھا۔ یہ انیس صاحب کا ہی آئیڈیا ہو گا۔ انہیں اس کی پیشہ ورانہ ضروریات کا احساس ہو گا۔ انہوں نے خاص طور پر یہ کمرہ تیار کیا تھا۔ اس میں ایک بڑی رائٹنگ ٹیبل تھی۔ سامنے کھڑکی بھی تھی اور بالکونی بھی۔ داہنی جانب والی دیوار پر ایک دیواری شیلف تھا۔ وہاں اردو ادب، انگریزی ادب اور ایڈروناٹزنگ کے موضوع پر چیدہ چیدہ کتابیں ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف ایک آرام دہ کاؤچ تھی۔ کمرے میں بہت نفیس قالین بچھا ہوا تھا۔

عمران کو فلیٹ میں سب سے اچھا کمرہ لگا تھا۔ یہاں قدرتی طور پر بہت سکون تھا۔ پہلے دو دن تو اسے کمرے میں آنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا مگر گزشتہ روز وہ اس کمرے میں آیا اور دو گھنٹے سے زیادہ بیٹھا تھا۔ اتنی دیر میں اسے احساس ہو گیا کہ تخلیقی کاموں کے لیے یہ کمرہ بہت موزوں ہے۔ یہاں بیٹھ کر وہ کسی پبلسٹی پروجیکٹ پر بہت اچھی طرح کام کر سکتا تھا۔ اس کا تاثر تھا کہ یہ کمرہ کچھ کرنے پر اکساتا ہے۔

لیکن اس وقت اس کی ذہنی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی تخلیقی کام کے بارے میں سوچتا۔ اس وقت تو اس پر ڈپریشن طاری تھا۔ تاہم کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے رائٹنگ پیڈ اپنی طرف کھینچا اور قلم کھول لیا۔

اسے احساس تک نہیں ہوا کہ وہ کاغذ پر قلم چلا رہا ہے۔

دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے اور یہ دستک کیسی ہے۔ اتنی سی دیر میں وہ بالکل خالی الذہن ہو چکا تھا۔ یہ دستک بھی اس کے لیے نئی بات تھی۔

اسے خیال آگیا کہ ثمنہ چائے لائی ہو گی۔ ”آجاؤ پلیز۔“ اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

ثمنہ ٹرے لیے ہوئے کمرے میں آئی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی تھے۔ ”یہ لیجئے جناب گرما گرم چائے۔“ اس نے پیالی میز پر عمران کے سامنے رکھ دی اور پھر بسکٹوں کی پلیٹ۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی یہیں بیٹھ کر چائے پی لوں؟“

”کیوں نہیں۔ بیٹھو۔“

سامنے والی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے ثمنہ نے پیڈ پر نظر ڈالی۔ وہاں بے معنی لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا دل پھر کٹنے لگا۔ عمران ایسی مچھلی کی طرح لگ رہا تھا جسے ندی سے نکال کر ایکویریم میں رکھ دیا گیا ہو۔

اس نے چائے کی پیالی سامنے رکھی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”بسکٹ لیں نا۔“

”نہیں۔ بالکل خواہش نہیں ہے۔“ عمران نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔

ثمنہ نے بھی چائے کا گھونٹ لیا۔ ”آپ بہت اداس ہیں۔ ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

”سب لوگ یاد آ رہے ہیں نا؟“

عمران نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں اڑا رہی ہے لیکن اس کی آنکھوں میں اسے تاسف کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ ”ہاں۔ میں اداس بھی ہوں اور مجھے سب لوگ یاد بھی آ رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں گئے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ ثمنہ کی آنکھیں بھی اداسی سے بھر گئیں۔ شاید کچھ روکے گئے آنسوؤں کی دھند بھی تھی۔ ”میرا تو تین دن سے یہی حال ہے۔“

”لڑکیوں کے لیے تو یہ ایک لازمی تبدیلی ہے جس سے انہیں گزرنا ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے تیار بھی ہوتی ہیں۔“

”تیار ہونے سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ جدائی تو جدائی ہی ہوتی ہے۔“ ثینہ نے کہا پھر اچانک ہی بولی۔ ”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”کیوں..... ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟“

”آپ کو خواہ مخواہ کا دکھ میری وجہ سے ہوا۔“

”نہیں، میں ناراض تو نہیں ہوں۔“ عمران نے سچائی سے کہا۔ ”البتہ افسردہ ضرور ہوں اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم جیسی پیاری لڑکی نے اتنی نامعقول شرط کیوں عائد کی۔ یہ تو بہت بڑی زیادتی ہے۔“

ثینہ مسکرائی۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ شکایتیں زبان پر آجائیں۔ ورنہ دلوں میں کدورت بڑھتی جاتی ہے۔ ”میرا خیال ہے، میں نے زیادتی نہیں کی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”زیادتی تو جب ہوتی کہ میں بعد میں فساد کھڑا کرتی، گھر میں ہنگامے ہوتے، دلوں میں فاصلے بڑھتے اور ہوتا پھر بھی یہی کچھ۔“

”بات تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میرے نزدیک تو اب بھی یہ زیادتی ہی ہے۔“

”اچھا ایک بات بتائیں۔ آپ اسے زیادتی سمجھتے ہیں تو آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ میرا خیال تھا کہ اس شرط کے ساتھ دنیا کا کوئی مرد مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔“

عمران نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔ شک کا کن کھجور اس کے دماغ میں سرسرایا۔ گویا یہ چاہتی تھی کہ کوئی بھی رشتہ آئے، اس شرط کی وجہ سے انکار ہو جائے۔ اس نے سوچا لیکن ثینہ کے چہرے پر معصومیت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

”آپ نے جواب نہیں دیا میری بات کا؟“ ثینہ نے اسے یاد دلایا۔

”جی یہ ہے کہ میں اس شرط کے ساتھ شادی کبھی نہ کرتا۔“ عمران نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن میں امی کو اختیار دے چکا تھا اور امی اور ابو کو تم لوگ اتنے پسند آئے تھے کہ انہیں تمہاری یہ شرط بھی بری نہیں لگی۔ بلکہ امی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تم انہیں اس شرط کے باوجود گھر میں تفرقہ ڈالنے والی ہرگز نہیں لگتیں۔“

یہ سن کر ثینہ جس بے ساختگی سے مسرت بھرے انداز میں مسکرائی، اسے دیکھ کر عمران کا شک ڈھل گیا مگر فوراً ہی ثینہ سنجیدہ بھی ہو گئی۔ ”بس، اور کوئی وجہ نہیں تھی؟“

عمران نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم جو سننا چاہتی ہو، میں وہ بھی کہہ دیتا ہوں۔ جی یہ ہے کہ تم مجھے اچھی لگی تھیں لیکن تمہارے ابا جان مجھے تم سے زیادہ اچھے لگے۔“

”ابا جان ہیں بھی بہت اچھے لیکن یہ تو بتائیں، تصویر سے بھی کوئی کسی کے بارے میں جان سکتا ہے؟“

”تمہیں تو معلوم ہی نہیں۔ ربانی صاحب کی بیٹی کی شادی میں، میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا تھا۔“

”اوہ..... عذرا کی شادی میں۔“ ثینہ نے حیرت سے کہا۔ ”واقعی..... مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔“

عمران نے چائے کی پیالی خالی کر کے رکھ دی۔ ”چائے تو تم نے بہت اچھی بنائی۔“

”کھانا بھی ٹھیک ٹھاک پکالیتی ہوں۔ اچھا..... اب کیا پروگرام ہے؟“

”میں کچھ دیر آرام کروں گا۔“

”جی نہیں۔ یہ زیادتی ہے۔ ایک تو آپ کو چھٹی اتنی کم ملی پھر اس میں بھی کام۔“

”تو پھر کیا کروں؟“ عمران نے قلم بند کر کے رکھ دیا۔

”یہ میٹل بتاؤں گی آپ کو!“ ثینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆=====☆=====☆

وہ دن خواب کے عالم میں گزرے۔ عمران کو ثینہ کے سوانہ کچھ یاد تھا، نہ ہی کسی بات کا احساس تھا۔ وہ بلاشبہ اس کی زندگی کے خوب صورت ترین دن تھے۔ تیسرے دن فرمان ملازمہ کو لے آیا۔ ملازمہ کا نام زیب النساء تھا۔ اس نے بتایا کہ سب اسے زیبو کہتے ہیں۔

دردانہ بیگم نے زیبو کو سب کچھ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ عمران کو بھی اطمینان تھا کہ امی نے بہت چھان پھٹک کے بعد زیبو کو بھیجا ہو گا۔ یہ اس کے لیے بے فکری ہو گئی۔ اب وہ خود کو اپنے آفس اور اپنے کام کے لیے تیار کر رہا تھا۔

عمران نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ معمولات بنتے گئے۔ زیبو معمول کے مطابق ہفتے بھر دہل رہتی اور پھر ایک دن کی چھٹی کرتی۔ ہفتے میں ایک دن عمران اور ثینہ ایاز صاحب کے ہاں جاتے اور ایک دن انیس صاحب کے ہاں۔ کبھی وہ لوگ خود بھی ان سے ملنے کے لیے آجاتے۔ زندگی بہت سکون سے گزر رہی تھی۔ کبھی کبھی عمران کو حیرت ہوتی کہ اس

کے واسطے کیسے آسانی سے دھل گئے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس پُر سکون زندگی میں کبھی تلامطم بھی پیدا ہوگا۔ لیکن ہونے والی بہت تو ہو کر رہتی ہے۔

ان کی شادی کو تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس روز عمران دفتر سے آیا تو کام اپنے ساتھ لایا۔ ان دنوں وہ ایک کمرشل پر کام کر رہا تھا۔ گھر میں اسٹڈی ہونے سے اسے یہ سہولت ہو گئی تھی کہ کام کا دباؤ زیادہ ہوتا تو وہ پہلے کی طرح دفتر میں زیادہ دیر نہیں رکھتا تھا۔ وہ چھٹی کے وقت چھٹی کرتا اور اضافی کام کے لیے اپنی اسٹڈی میں بند ہو جاتا۔ اس روز بھی وہ اپنی اسٹڈی میں کام کرتا رہا۔

نوبے ٹینے نے اسے یاد دلایا کہ کھانا کبھی کھانا ہے۔ انہوں نے کھانا کھایا اور معمول کے مطابق چل قدمی کے لیے نکل گئے۔ وہ کھلا علاقہ تھا۔ چل قدمی میں لطف آتا تھا۔ واپسی میں پارک سے گزرتے ہوئے عمران کو وہاں غیر معمولی نقل و حرکت کا احساس ہوا لیکن اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

پارک سے گھر آتے ہوئے نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔..... ان پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس نے کئی بار پلٹ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا مگر عمران کی تسلی نہیں ہوئی۔ اندھیرا زیادہ اور روشنی کم ہو تو سائے بھی بہت بنتے ہیں اور سایہ سائے کو تحفظ دیتا ہے۔

اس رات عمران گرانی شکم کا بھی شکار تھا۔ اس نے دوا لی۔ اس کے باوجود وہ آسانی سے نہ سو سکا۔ دیر تک وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اگلی صبح دفتر کے لیے جلدی اٹھنے کا تصور الگ اس کے لیے اعصابی دباؤ کا سبب بن رہا تھا، بالآخر اسے نیند آگئی۔

خواب میں بھی اسے مودوم سا احساس تھا کہ یہ سب کچھ جزئیات کے فرق کے ساتھ وہ پہلے بھی دیکھ چکا ہے لیکن اس سے خواب کی خوف ناک میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس بار خواب پہلے سے زیادہ خوف ناک لگا۔ اس لیے کہ وہ زیادہ حقیقی تھا۔

اس بار وہ ابو کے گھر میں نہیں، اپنے فلیٹ میں تھا اور فلیٹ میں اس کے ساتھ ای ابو اور بہن بھائی نہیں تھے، بس ٹینے تھی۔ سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا۔ البتہ اس بار سرغنہ ٹینے کو لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور ٹینے..... وہ ہونٹوں پر چپکنے والی مسکراہٹ کا گلا گھونٹنے میں تو کامیاب رہی تھی لیکن وہ مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں بے

حد عیاں نظر آ رہی تھی۔

اور اس بار ڈاکوؤں کا سرغنہ اسے اس کی اسٹڈی میں لے گیا تھا۔ اس کے مکانے وہی پہلے خواب والے تھے لیکن فائر ہونے سے پہلے ہی عمران کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چیخنے کی نوبت نہیں آئی ورنہ وہ چیختا اور ٹینے کی آنکھ کھل جاتی تو پھر سوال جواب کا تکلیف دہ مرحلہ شروع ہو جاتا۔ وہ اٹھا تو اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ دل یوں تیز تیز دھڑک رہا تھا جیسے سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ اس نے سرگھما کر ٹینے کو دیکھا، اس کی ہموار سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ بے خبر سوئی ہوئی ہے۔ نیند میں وہ اور خوب صورت اور معصوم لگ رہی تھی۔

وہ بہت آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لائٹ آن کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ٹینے جاگے اور امکان یہی تھا کہ اب وہ سو نہیں سکے گا۔ بچپلی بار اس نے خواب دیکھا تھا تو اسے صبح دفتر جانے کی فکر نہیں تھی اور اسے یاد تھا کہ اس روز وہ گیارہ بجے کے بعد ہی جاگا تھا لیکن آج وہ دیر تک سونے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا دو بجے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ تین بجے تک نیند نہیں آئی تو پھر وہ سوئے گا ہی نہیں۔ اسے خیال آیا کہ وہ اٹھ کر اسٹڈی میں چلا جائے لیکن اول تو خواب میں اسٹڈی دیکھنے کے بعد اس میں اسٹڈی کا رخ کرنے کی بہت ہی نہیں تھی، دوسرے یہ خطرہ بھی تھا کہ ٹینے کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اسے بستر پر موجود نہ پایا تو پریشان ہو کر اسے ڈھونڈتی پھرے گی۔ چنانچہ وہ بستر پر ہی بیٹھا رہا جو کچھ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا، سوچنے پر مجبور تھا۔

اس بار صورت حال بدلی ہوئی تھی۔ ٹینے سے اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ کتنی ہی جانب داری سے کام لے، یہ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ وہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے۔ اس بار خواب بھی مختلف تھا لہذا اسے سوچنا بھی مختلف انداز میں تھا۔

یہ تجربہ اسے پہلے بھی ہو چکا تھا کہ پُر سکون سطح سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے گہرائی کو نزلنا بھی ضروری ہے۔ گہرائی میں گڑبڑ ہو تو بھی سطح بہت عرصے تک پُر سکون رہ سکتی ہے شاید اس کی گہرائی بھی بہت زیادہ تھی۔

یہ بات طے تھی کہ وہ شعور کو مکڑیوں کے جالوں سے صاف کر لیتا ہے لیکن پس شعور تک اس کی رسائی نہیں۔ تحت الشعور اور لاشعور اس کی دسترس میں نہیں۔

اس نے شعور کو صاف کر کے اپنا اطمینان کر لیا تھا لیکن شک اور وہم کی مکڑیوں نے اس کے تحت الشعور کو جالوں سے بھر دیا تھا۔ جب تک وہ صاف نہیں ہو جاتا، وہ پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا۔ اب وہ غور کر رہا تھا کہ اس نے امی سے ملازمہ کے لئے کیوں کہا جبکہ شعوری طور پر وہ کچھ اور فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے تو انیس صاحب کی ترکیب کو اور آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا جنہوں نے بڑا فلیٹ اس لئے دیا تھا کہ اس میں صرف دو افراد رہیں گے تو کنبے کی افادیت کو جلدی سمجھ سکیں گے۔ اس نے شادی کے لئے زیادہ چھٹی اصرار نہیں کیا تھا کہ پانچ کمروں کے فلیٹ میں ٹینہ دن بھر اکیلی رہے گی تو اور جلدی گھر جائے گی تو پھر اس سیٹ اپ میں ملازمہ کی گنجائش کہاں نکلتی تھی۔

اسے یاد تھا کہ امی سے ملازمہ کے لئے بات کرتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ کہیں شک کی بنا پر تو یہ بندوبست نہیں کر رہا ہے، اور اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہی بات تم اور اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی ٹینہ کو فون پر بات کرنے والی ٹینہ ہی سمجھ رہے۔ فون والی ٹینہ نے اپنے چاہنے والے سے کہا تھا کہ اس نے ایسا بندوبست کر لیا کہ اس کی شادی کے بعد بھی مل سکیں گے، ملنے رہیں گے اس لئے کہ وہ سرال علیحدہ..... اکیلی رہے گی۔

یہ خیال ہی عمران کے لئے شرم ناک تھا کہ وہ اپنی بیوی پر شک کرتا ہے۔ اسے ہے کہ موقع ملا تو ٹینہ اس شخص سے گھر کی تنہائی میں ملے گی، جس سے وہ محبت کرتی رہا ہے۔ یہ تو گھٹیا پن تھا اور پھر بیوی بھی اس کی ٹینہ جیسی، تین ماہ میں اس نے دیکھا تھا ٹینہ کے کسی انداز میں کبھی تصنع نہیں ہوتا۔ اس کے انداز کا والہانہ پن اس لڑکی کا سا جو پہلی بار کسی کی محبت میں مبتلا ہوئی ہو۔ نہ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کی محبت ہے، کسی سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ نہیں وہ ایسی ہے نہیں۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ وہ اس کے لئے اس انداز میں سوچتا رہا ہے۔

اسی وقت اس کے اندر ایک آواز ابھری۔ ٹینہ نے علیحدہ رہنے کی شرط اس خیا سے عائد کی تھی کہ اس شرط کی وجہ سے دنیا کا کوئی مرد اس سے شادی کرنا قبول نہ کرے گا۔ وہ بے ساختہ خیال تھا۔ عمران اندر ہی اندر لرز کر رہ گیا۔ یعنی وہ اب بھی شہ کے بارے میں اسی انداز میں سوچ رہا ہے!

لیکن جب اس نے ٹینہ کو یہ بتایا تھا کہ اس کے بارے میں امی کی کیا رائے تھی

اس کا رد عمل بہت بے ساختہ تھا۔ وہ اپنی خوشی چھپا نہیں سکی تھی۔ اگر فیصلہ دلیلوں پر ہوتا ہے تو اس دلیل کی اہمیت بھی اپنی جگہ ہے۔

مگر بات دلیل کی نہیں تھی۔ اس نے شادی کا فیصلہ کرتے ہوئے ہر شک کو مسترد کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شک کی بنیاد پر ازدواجی زندگی کی عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی۔ دل میں شک ہو تو شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔ اب اس کا کیا علاج کہ شک لاشعور میں بسا ہو اور آدمی اس سے بے خبر ہو۔

الحسن نے ایک بار پھر سوتی ہوئی ٹینہ کو دیکھا اور اسے خود پر شرم آنے لگی۔ اگر ٹینہ کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس کے بارے میں کس انداز میں سوچ رہا ہے تو اس پر کیا گزرے گی۔ نہیں..... اسے اس چیز سے لڑنا ہو گا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے تین بجے تھے۔ نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ یعنی اب اسے جاگنا تھا۔ ورنہ صبح اٹھنا ممکن نہیں رہتا۔ اس کے باوجود چار بجے کے بعد وہ کسی وقت سو گیا۔

☆=====☆=====☆

اس کی آنکھ کھلی تو گیارہ بجنے والے تھے! اس نے سر گھما کر دیکھا۔ ٹینہ بستر پر موجود نہیں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ ٹینہ نی وی لاؤنج میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر سے دیکھا اور بولی۔ ”اٹھ گئے آپ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”رات گرانی کی وجہ سے دیر تک سو نہیں سکا تھا۔ اب تو طبیعت ٹھیک ہے۔“ عمران نے کہا۔ پھر پھر پوچھا۔ ”تم کب اٹھیں؟“

”میں سات بجے اٹھ گئی تھی۔“

”پھر مجھے کیوں نہیں جگایا؟“

”کسی کو جگانے کی جس حد تک کوشش کی جاسکتی ہے، میں نے کی لیکن آپ نے نیند میں ہی صاف انکار کر دیا اٹھنے سے۔ میں نے دفتر جانے کا بھی یاد دلایا تو آپ نے کہہ دیا کہ آج چھٹی کریں گے۔“

”اوہ..... مجھے تو یاد نہیں۔“ عمران کو پھر اپنے لاشعور کا خیال آیا۔ اس کا لاشعور کچھ زیادہ ہی طاقت ور تھا شاید۔ اسے رات کا خواب اور پھر اپنی سوچیں یاد آئیں۔ اسے

نجات ہونے لگی۔

”آپ ہاتھ روم جائیں۔ میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔“

عمران ہاتھ روم جانے سے پہلے اپنی اسٹڈی میں چلا گیا، جہاں فون رکھا تھا۔ یہ سہولت ابھی دس بارہ دن پہلے ہی حاصل ہوئی تھی۔ عام طور پر فون اتنی جلدی لگتا نہیں لیکن ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا اثر و رسوخ کام آیا تھا۔

اس نے فون پر اپنی سیکریٹری کو بتایا کہ وہ آج دفتر نہیں آئے گا پھر وہ ہاتھ روم میں چلا گیا۔ ہاتھ روم سے نکلا تو ناشتہ تیار تھا۔ عمران کو ٹینے کی یہ ادا بھی بہت اچھی لگی تھی کہ زیبو کے ہوتے ہوئے بھی اس نے کھانے پکانے کا کام خود اپنے ذمے لیا تھا۔

دونوں نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ ”اب کیا پروگرام ہے؟“ ٹینے نے پوچھا۔

”بس آج عیش کریں۔ آج جی چاہ رہا ہے کہ خوب باتیں کی جائیں۔“ عمران نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا باتیں کریں گے؟“ ٹینے بھی مسکرائی۔

”بس ادھر ادھر کی..... دنیا بھر کی۔“

”مگر ابھی مجھے کھانا پکانا ہے۔ کھانا کب کھائیں گے؟“

”ابھی تو ناشتہ کیا ہے۔“ عمران نے کہا۔ ”کھانا تو دیر سے ہی کھایا جائے گا۔“

”پھر بھی“ میں تو ایک بجے کھانا پکا کر فارغ ہو جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اتنی دیر اسٹڈی میں کچھ کام کر لوں گا۔ تم فرصت ہوتے ہی

آجانا۔“ عمران نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی اسٹڈی میں گیا۔ زیبو وہاں صبح ہی صفائی کر چکی تھی۔ وہ اپنی میز پر جا بیٹھا لیکن کام کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور رات کے بارے میں وہ اب سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جاکر لاؤنج سے اخبار اٹھا لایا۔ اخبار پڑھنے کے بعد اس نے ایک کتاب نکال لی جو صارفین کی نفسیات اور فن تشیر کے موضوع پر تھی لیکن وہ ٹھیک طور سے کتاب بھی نہیں پڑھ پا رہا تھا۔ ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ایک بجے کے ذرا بعد ٹینے اسٹڈی میں چلی آئی ”چائے پیئیں گے یا کھانا لگا دوں؟“ اس نے پوچھا۔

”بھوک تو ابھی ہے نہیں۔ چائے پیوں گا تو شاید کھانے کا امکان ہی نہ رہے۔ آؤ

بیٹھو۔“

ٹینے بیٹھ گئی۔ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ بات سیاست اور حالاتِ حاضرہ سے ہوتی ہوئی روزمرہ مسائل تک آگئی۔ عمران بے حد غیر محسوس طریقے سے اسے مسئلہ بے روزگاری تک لے آیا۔ ”جیسے یلو کب بہت مثبت اسکیم تھی۔“

”اس میں بھی بڑے کھیلے بڑی بے ایمانیاں ہوئیں۔“ ٹینے نے کہا۔

”ہاں اس لئے کہ ہمارا ملک بد قسمتی سے کرپشن کے معاملے میں دنیا کے ترقی یافتہ

ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ اس سے اسکیم کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ گھپلوں کے باوجود اس اسکیم سے بڑے فائدے ہوئے۔ ایک طرف بے روزگار لوگوں کو روزگار میسر آیا۔ دوسری طرف پڑھے لکھے جوان لوگ اس میدان میں آئے تو نیکی

ڈرائیور کا روایتی امیج تبدیل ہوا پھر ایک زاویے سے اسلامی تعلیمات پر عمل ہونے لگا۔ یہ احساس عام ہوا کہ رزقِ حلال کی جدوجہد عبادت سے کم نہیں۔ کوئی بھی کام کرنے میں برائی نہیں۔ ہاں چوری، نقب زنی اور ڈکیتی بری بات ہے۔ ناجائز ذرائع سے دولت کمانا برا

ہے۔ اس سے پہلے بڑے معزز خاندانوں کے لڑکے صرف اس لئے بے روزگار پھرتے تھے کہ انہیں شلیانِ شان کام نہیں مل رہا ہے۔ کوئی عام سا کام کریں گے تو خاندان کی عزت کو بے لگے لگے گا۔ یہ بہت بڑی اور مثبت تبدیلی ہے۔“

”مجھے آپ کی اس آخری بات سے اختلاف ہے۔“ ٹینے نے کہا۔ ”تبدیلی صرف اس حد تک آئی ہے کہ مردوں کے بغیر کہیں جانے والی عورتیں اب نیکی میں بیٹھنے سے نہیں گھبراتیں۔ باقی معاشرے میں نیکی ڈرائیور کو اب بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ بیشتر اچھے گھرانے انہیں رشتہ دینے سے کتراتے ہیں۔“

یہ آخری بات سن کر عمران کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔

”خاص طور پر کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ نیکی ڈرائیور کو اب بھی حقیر سمجھتے ہیں۔“ ٹینے اس کی کیفیت سے بے نیاز کہتی رہی۔ اس کے لہجے میں اداسی اتر آئی تھی ”اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی کہ محنت سے رزقِ حلال کیا جا رہا ہے۔“

”اچھا!“ عمران نے لہجے میں حیرت سموتے ہوئے کہا۔ ”میرا مشاہدہ تو بالکل مختلف ہے۔“

”میں یہ نہیں کہہ رہی کہ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔“ ٹینے نے جلدی سے کہا۔ ”متوسط طبقے نے اسے قبول کر لیا ہے لیکن جن خاندانوں میں دولت اور نام و نسب کا زعم

ہو وہ اپنے کسی لڑکے کو نیکی ڈرائیور دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ایسے لڑکوں کو رشتہ بھی نہیں دیتے۔

”کوئی عملی مثال اس کی تمہارے سامنے ہے؟“

”ہاں، میرے ایک کزن ہیں۔ ان کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ وہ اپنی پسند کی شادی بھی نہیں کر سکے۔ صرف اس لئے کہ وہ یلو کیب چلاتے ہیں۔“

عمران کے لئے خود کو مل رکھنا مشکل ہو گیا۔ ”مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔“

”افسوس تو مجھے بھی ہے لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یہ زندگی ہے۔“

”تمہارے ان کزن کا نام کیا ہے؟“ عمران نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”ظہیر..... ظہیر بھائی۔“

”تمہارے ابا جان تو ان سے ناخوش نہیں ہوں گے۔“

”جی نہیں۔ ابا جان بھی ان سے خوش نہیں ہیں۔“

”اور تم؟“

”مجھے تو بھی وہ اچھے لگتے ہیں۔ پڑھ لکھے ہیں۔ خوش شکل ہیں۔ کوئی عیب نہیں

ان میں۔ کردار کے اچھے ہیں۔ اخلاق بھی اچھا ہے۔“

عمران کے وجود میں رقابت کی ایک تند موج اٹھی اور جانے کتنے گھر وندے گرا

گئی۔ تاہم اس نے کوشش کی کہ چہرے پر اندر کی کیفیت کا کوئی عکس نہ جھلکے۔ کچھ وہ اس

میں کامیاب بھی رہا اور کچھ یہ بھی تھا کہ شینہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ تو کہیں

کھو سی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ اور ملال کا تاثر بے حد واضح تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی۔ ”میں کھانا لگاتی ہوں۔ دو بج چکے ہیں۔“

عمران نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں چلا آیا لیکن اس سے

کھانا نہیں کھایا گیا۔

☆=====☆=====☆

عذاب اور بڑھ گیا!

وہ تو اپنے لاشعور سے جنگ لڑنے، کمزریوں کے جالے صاف کرنے کا ارادہ لے کر

چلا تھا مگر شینہ کے تازہ ترین انکشاف کے بعد اسے احساس ہو رہا تھا کہ کمزریوں کے جالے

تو اس کے شعور میں بھی گھسے آرہے ہیں۔ اب وہ اس شک سے بچ بھی نہیں سکتا تھا اور

لڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ شینہ سے کھینچ گیا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ شینہ کو احساس نہ ہونے دے لیکن ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ شینہ کو احساس ہو گیا۔

”مجھ سے کچھ ناراض ہیں آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”ایسی باتیں خود سے پوچھنی چاہئیں۔“ عمران نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”تم نے

کوئی ایسی بات، کوئی حرکت کی، جس پر میں تم سے ناراض ہوں۔“

”ایسا کچھ کیا تو نہیں میں نے لیکن کبھی لاعلمی میں بھی کوئی غلطی، کوئی زیادتی ہو جاتی

ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ عمران نے مختصر آکھا۔

”تو پھر؟ پریشان ہیں؟“

اس سوال کا جواب سچائی سے دیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ عمران نے اثبات میں جواب دے

دیا۔

”کیوں پریشان ہیں۔ مجھے نہیں بتائیں گے؟“

یہ ٹیڑھا سوال تھا۔ عمران نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”ان دنوں میں ایک

بڑے پلٹنی پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ اسے جلدی مکمل کرنا ہے اور مجھے کوئی آئیڈیا

نہیں ہی نہیں رہا ہے۔ بس یہ الجھن ہے۔“

”تخلیقی کام ہے۔ پریشان ہونے سے تو اور مشکل ہو جائے گا۔ آپ پرسکون

ہو جائیں۔ ریلیکس کریں۔“

اب عمران اسے کیسے بتاتا کہ ریلیکس ہونا اس کے لئے ممکن نہیں۔ ”یہ اپنے اختیار

میں کب ہوتا ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

شینہ خاموش ہو گئی۔

اگلے روز بچ کے بعد عمران نے دفتر سے فلیٹ کا فون نمبر ملایا۔ اسے حیرت ہونے

لگی۔ کھنی مسلسل بج رہی تھی لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ نمبر ملایا۔

اس بار بھی دیر تک کھنی بجتی رہی۔ آخر کار دسویں کھنی کے بعد ریسپونڈ اٹھایا گیا۔

”ہیلو؟“ دوسری طرف سے شینہ کی ہانپتی ہوئی آواز ابھری۔ آواز سے اندازہ ہو رہا

تھا کہ اس کی سانسیں بے ترتیب ہیں۔

”یہ میں نے دوسری بار فون کیا ہے۔“ عمران چڑچڑا پن نہ چھپا سکا۔ ”پہلی بار بھی

دس بارہ مرتبہ بیل گئی۔ اس بار بھی تم نے دس بار گھنٹی بجنے کے بعد فون اٹھایا ہے۔
”میں کچن میں تھی۔ فون کی آواز ہی نہیں آئی۔ ابھی میں کسی کام سے کچن سے نکل
تو گھنٹی کی آواز سنی۔“

”ہانپ کیوں رہی ہو؟“

”بھاگتی ہوئی آئی ہوں۔ ہانپوں گی نہیں!“

”زیو کہاں ہے؟“

”بازار گئی ہے۔“

فون اٹھانے میں دیر ہونے پر عمران پہلے ہی شک کی دھیمی دھیمی آگ میں جل رہا
تھا۔ یہ سن کر وہ آگ پوری طرح بھڑک اٹھی کہ ٹینے گھر میں اکیلی ہے۔ اس کا تصور
پوری طرح متحرک ہو گیا۔ اس نے بلڈنگ کے باہر ایک یوکیب کھڑی دیکھی اور اپنے
فلیٹ میں.....

اس سے آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ ”زیو کو کیوں بھیجا تم نے؟“ اس نے بے
حد درشت لہجے میں کہا۔

”تو اور کیا کرتی۔“ ٹینے کے لہجے میں حیرت اور شک تھا۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو
تو اسے بازار نہیں بھیج سکتی کیا۔ اسے کوئی اعتراض بھی نہیں۔“

”لیکن مجھے اعتراض ہے۔“ عمران اب تقریباً چلا رہا تھا۔

”کیوں؟“

اس کیوں میں جانے کیا تھا..... اور ٹینے کے لہجے میں کوئی بات تھی، جس نے عمران
کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ تصور سے حقیقی دنیا میں لوٹ آیا۔ اسے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اسے
اپنے آپ سے باہر ہونے کے سلسلے میں جواب دی کرنی ہوگی۔ ٹینے کو احساس نہیں ہونا
چاہئے کہ اس کے ذہن میں کوئی ایسی ویسی بات تھی۔

اب لہجے کو ایک دم نرم کر لینا بھی مناسب نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے بدستور درشت
لہجے میں کہا۔ ”حالات بھی اچھے نہیں پھر وہ علاقہ بھی سنسان رہتا ہے۔ میں تمہیں اکیلا
نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس تصور سے ہی مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔“

”اوہ..... میرا اتنا خیال ہے آپ کو۔“

”کیا نہیں ہونا چاہئے؟“

”شکریہ۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔ یہ بتائیے، فون کیوں کیا تھا آپ نے؟“
”صرف تمہاری آواز سننے کے لئے۔ اور سب ٹھیک ہے نا؟“
”جی ہاں۔ آپ کب آئیں گے؟“

”وہی چھٹی کے وقت۔ اچھا خدا حافظ۔“

ریسور رکھنے کے بعد عمران نے رومال سے چہرے کا پسینہ صاف کیا۔ اپنے رد عمل
پر وہ بے حد متوحش ہو گیا تھا۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ سب کچھ کھل کر
سامنے آ گیا تھا۔ وہ بہت خوف ناک آگ میں جل رہا تھا۔ اس آگ میں جلتے ہوئے یہ کوئی
آسان کام نہیں تھا کہ وہ گھر میں بیوی کے سامنے ایک اعتماد کرنے والے شوہر کا کردار ادا
کرے۔ جبکہ درحقیقت وہ اس پر شک کر رہا ہے۔

اس دن کے بعد زندگی عمران کے لئے آسان نہیں رہی۔ ٹینے کی سمجھتی رہی کہ وہ
کام کے بوجھ کی وجہ سے چڑھا ہو رہا ہے۔

تین چار دن بعد عمران نے دوبارہ دفتر سے گھر فون کیا۔ اس بار زیو نے فون ریسو
کیا۔ ”زیو، ٹینے سے بات کراؤ۔“ اس نے کہا۔

”صاحب، باجی تو گھر میں نہیں ہیں۔“

عمران بھڑک اٹھا۔ ”کہاں گئی ہیں؟“

”بازار سے کچھ خریدنا تھا صاحب جی۔ بازار گئی ہیں۔“

”کتنی دیر ہو گئی گئے ہوئے؟“

”مجھے اندازہ نہیں صاحب۔ پر گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں بعد میں فون کر لوں گا۔“

عمران کا تصور پھر بے لگام ہو جاتا مگر اچانک ہی وہ بے حد مصروف ہو گیا۔ پہلے تو
اسے ایک کلائنٹ سے تقریباً ایک گھنٹے فون پر بات کرنا پڑی پھر ایم ڈی صاحب نے اسے
بلوالیا۔ انہوں نے ایک اور اکاؤنٹ اسے سونپ دیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ ان کے دفتر سے
نکلا تو فون پر ایک پھر طویل گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد چھٹی کا وقت ہو گیا تھا۔

وہ گھر پہنچا تو اس کا موڈ بہت خراب تھا۔ ٹینے نے اسے چائے لا کر دی۔ ”تم آج
کہاں چلی گئی تھیں؟“ اس نے بے حد خراب لہجے میں پوچھا۔

ٹینے نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”زیو نے بتا تو دیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”میں بازار گئی

تھی۔

”تو پھر مجھے فون کیوں نہیں کر لیا؟“ عمران نے نہ چاہتے ہوئے بھی جرح کی۔
”آپ نے زیو سے کہا تھا کہ آپ خود تھوڑی دیر بعد فون کر لیں گے پھر بھی کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے فون کیا تو انکیج کی ٹون آتی رہی۔“ ثمنہ نے کہا پھر بولی ”لیکن مسئلہ کیا ہے؟ کوئی خاص بات ہے؟“

”تمہیں اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہئے تھا۔ زیو کو ساتھ لے جاتیں۔“

”مگر اس میں حرج کیا ہے؟“

”گھر ایک ایسی ملازمہ پر چھوڑ دینا جسے ہم تھوڑے ہی عرصے سے جانتے ہیں بے وقوفی ہی کہلائے گی۔“ عمران نے بات بنائی۔

”یہ تو خیال ہی نہیں آیا مجھے۔“ ثمنہ نے کہا۔ ”مگر یہ مسئلہ عجیب ہے۔ ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ میں زیو کو کہیں نہ بھیجوں۔ دوسری طرف کہتے ہیں کہ میں اکیلی بازار نہ جاؤں۔ اب کسی چیز کی ضرورت پڑے تو کیا کروں۔“

”صبر اور انتظار۔“ عمران نے خشک لہجے میں کہا۔ ”تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو، وہ جمعے کو میرے ساتھ چل کر بازار سے خرید لیا کرو۔“

”بعض اوقات اچانک کسی چیز کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔“

”نہیں پڑنی چاہئے۔ شاپنگ کے لئے مکمل فرسٹ بنا کر نکلا کرو۔ تمہیں تو اس بات کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔ اس برتے پر اکیلی رہنے چلی تھیں۔“ عمران نے تلخی سے کہا۔

ثمنہ کو یہ طعنہ بہت برا لگا۔ ”اکیلی رہ سکتی ہوں اسی لئے تو بازار چلی گئی تھی۔ اکیلی۔“ ثمنہ کے لہجے میں پہلی بار تلخی آئی۔

”اس کی میں اجازت نہیں دوں گا۔ لہذا آئندہ یہ خیال رکھو کہ ضرورت کی ہر چیز گھر میں موجود رہے۔ کوئی چیز موجود نہ ہو تو اس کے بغیر کام چلانے کی عادت ڈالو۔“

اس کے بعد مزید بات تو نہیں ہوئی لیکن دونوں ایک دوسرے سے کھینچ گئے۔ گھر کی فضا پہلی بار کشیدہ ہوئی تھی۔

☆=====☆=====☆

مزید دو ہفتے گزر گئے!

اس روز ثمنہ کو غصہ آیا تھا لیکن اب وہ تشویش میں مبتلا تھی اور تشویش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ عمران کا طرز عمل اس کے لئے روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ بات کسی پروجیکٹ کی پریشانی کی یا حسب منشا کام نہ ہونے کی نہیں، کچھ اور ہے۔ جو تبدیلیاں آئی تھیں وہ بہت بڑی اور نمایاں تھیں۔ عمران چڑچڑا اور بد مزاج ہو رہا تھا۔ وہ محبت اور وہ نرمی جانے کہاں کھو گئی تھی، جس نے اسے عمران کی محبت میں گرفتار کر دیا تھا۔

ایک بڑی تبدیلی اور آئی تھی۔ اب دور ہونے کے باوجود ثمنہ یہ بات محسوس کر سکتی تھی کہ اس کی آواز سن کر عمران سکون کی سانس لیتا ہے۔ جیسے اس کی آواز سننا اس کے لئے خلاف توقع ہو اور کوئی بہت بڑی بات ہو۔

ثمنہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی!

لیکن اور بھی کئی باتیں تھیں، جن کی وجہ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ عمران اسے گھر پر اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ تنہا کہیں باہر جائے۔ اس بارے میں سوچتے ہوئے کوئی بات اس کے ذہن میں آتی تھی، جسے وہ گرفت میں نہیں لے پائی تھی مگر اسے یہ احساس ضرور تھا کہ وہ بات کسی ناپسندیدہ نتیجے سے متعلق ہے جو اس کے ذہن نے اخذ کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ اس بات کو سمجھنا نہیں چاہتی۔

ثمنہ بے حد سمجھ دار لڑکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہر بات کو کریدنا اور اسے سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ بے خبر رہا جائے تو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بہت بڑی بن جاتی ہیں۔

ثمنہ اس پر سوچتی رہی۔ وہ واقعات کی ترتیب یاد کر رہی تھی۔ وہ دن اسے خوب یاد تھا۔ اس روز عمران نے چھٹی کی تھی اور آزدواجی زندگی کے دوران اب تک وہ اس کی پہلی اور آخری چھٹی تھی۔ اس روز پہلی بار وہ بد مزاج نظر آیا تھا اور اس نے کام کو اس کی وجہ قرار دیا تھا۔ چند روز بعد وہ فون والا واقعہ پیش آیا تھا، جب زیو بازار گئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے تو وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔

اس پر سوچتے ہوئے اچانک وہ نتیجہ سامنے آگیا جس سے وہ جانے کب سے نظرسنچا جا رہی تھی۔

عمران اس پر شک کرنے لگا ہے۔

کچھ دیر کے لئے تو وہ سن ہو کر رہ گئی۔ وہ ساکت بیٹھی رہ گئی پھر اس کے اندر بڑی

شدت سے احتجاج ابھرا لیکن کیوں؟ اس نے خود سے پوچھا۔ اس دن سے پہلے عمران کے کسی انداز سے کبھی ایسا نہیں لگا۔ شکی شوہر تو پہلے ہی لمحے سے سامنے آجاتے ہیں۔ تین مہینے تو اسے کبھی یہ گمان بھی نہیں ہوا۔ عمران تو محبت کرنے والا، درگزر سے کام لینے والا بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا پھر اچانک یہ کیا ہو گیا۔ وہ اس پر شک کیوں کرنے لگا؟

ثمینہ نے پوری سچائی سے خود کو ٹٹولا۔ اپنے ہر فعل کا احتساب کیا لیکن عمران کے شک میں مبتلا ہونے کا کوئی جواز اسے نہیں ملا تو پھر؟ اسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، اسی دن ہوا ہے، جب عمران نے چھٹی کی تھی۔

عمران نے چھٹی کیوں کی تھی؟ گرمی شکم کی وجہ سے وہ بہت دیر تک سو نہیں سکا تھا۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔ اس نے اس امکان پر غور کیا۔ یہ عین ممکن تھا مگر کیا یہ ممکن ہے کہ عمران جیسا معقول آدمی محض ایک خواب کی بنیاد پر اپنی بیوی پر شک کرنے لگے؟ اس کا جواب یہ تھا کہ انسانی ذہن کسی بھی وقت کوئی بھی کرشمہ دکھا سکتا ہے۔

لیکن ثمینہ کو اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ عمران اس پر شک کرتا ہے، کوئی اور بات بھی تو ہو سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ یہ عمران کی کسی ہوئی ایک بات کے حوالے سے آیا تھا۔ عمران نے اسے اکیلے رہنے کے شوق کا طعنہ دیا تھا۔ یہ بات تو طے ہے کہ عمران کو اس طرح اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہونا پسند نہیں آیا ہے۔ کہیں وہ یہ سب کچھ اسے یہ احساس دلانے کے لئے تو نہیں کر رہا ہے کہ سب کے ساتھ رہنے کے بے شمار فوائد ہیں اور اکیلے رہنے کے عذاب بھی ہیں۔

یہ بات ثمینہ کے دل کو زیادہ لگتی تھی۔ عمران شکی ٹائپ کا تو نہیں تھا لیکن ماں باپ بہن بھائیوں سے بہت محبت کرنے والا ضرور تھا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ وہ بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ یعنی اس مسئلے کا حل بہت آسان تھا۔ وہ اعلان کر دے کہ اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہو کر وہ سسرال رہنا چاہتی ہے اس کے بعد تمام مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

ایک جہنم کی آگ تھی، جس میں وہ جل رہا تھا!

اب وہ دن میں کئی بار دفتر سے گھر فون کرتا۔ اس کے ذہن پر بس ایک ہی خیال مسلط رہتا۔ ثمینہ اس سے بے وفائی کر کے رہے گی۔ اب تمام کڑیاں مل چکی ہیں اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ فون پر اس نے اتفاقاً جو گفتگو سنی تھی، وہ ثمینہ اور اس کے کزن ظمیر کی تھی۔ اب تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ فون کرنے والی کی آواز سو فیصدی ثمینہ ہی کی تھی۔ وہ لاکھوں میں ایک اتفاق تھا کہ اس نے وہ گفتگو سن لی تھی ورنہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔

دشواری یہ تھی کہ اسے ثمینہ سے محبت ہو گئی تھی۔ یہ تصور بھی اس کے لئے سوبان روح تھا کہ ثمینہ کسی اور سے محبت کرتی ہے اور اب جب بھی وہ اس کے سامنے ہوتی یہ خیال اسے ڈستار رہتا۔ وہ بڑی اذیت اٹھا رہا تھا۔ ثمینہ کا سامنا کرنے سے اسے خوف آنے لگا۔ بھلا وہ کب تک، یہ سب کچھ اس سے چھپا سکتا تھا۔ بلکہ اسے تو لگتا تھا کہ ثمینہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی ہے لیکن وہ کھل کر بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے وہ گریز کر رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے احساس تھا کہ اس سے اس کا ہی گھنپا پن ثابت ہو گا۔

اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ دفتر میں دیر تک رکا رہتا۔ رات کو تھکا ہارا گھر پہنچتا تو ثمینہ کا زیادہ دیر تک سامنا نہ کرتا۔ جھکن کا بہانہ کر کے جلدی سونے کے لیے لیٹ جاتا۔ یہ الگ بات کہ اسے ٹھیک طرح سے نیند بھی نہیں آتی۔ مسلسل نیند کی کمی کی وجہ سے اس کی صحت پر بھی برا اثر پڑ رہا تھا۔ ذہنی کیفیت بھی اچھی نہیں اور اس کے نتیجے میں اس کی کام کرنے کی صلاحیت بھی متاثر ہو رہی تھی۔ پہلے اس کا کام ایڈوائس رہتا تھا لیکن اب اسے احساس تھا کہ اس پر ایک دم کام کا دباؤ آنے والا ہے اور وہ اس کے لئے تیار بھی نہیں ہے جبکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے کئے کرائے پر یوں پانی پھر جائے۔ کیریئر کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ وہ اس میں خرابی نہیں چاہتا۔

درحقیقت اس دباؤ نے ہی اسے مجبور کیا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرے۔ معاملات کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تو تباہی یقینی تھی اور وہ معمولی تباہی نہ ہوتی اس میں سبھی کچھ تباہ ہو جاتا۔

سوال یہ تھا کہ وہ بات کس سے کرے۔ ثمینہ سے بات کرنے کو وہ تیار نہیں تھا۔ ایک وحید ہی تھا جس سے بات کی جاسکتی تھی۔ حالانکہ اس میں بھی اس کے لئے شرمندگی ہی تھی۔

”چل کر کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھیں گے، جہاں سکون سے بات کی جاسکے۔ میں ذرا یہ میز سمیٹ لوں۔“

☆=====☆=====☆

اس نے وحید کے دفتر کا نمبر ملایا۔ وحید سے فوراً ہی بات ہو گئی۔ ”وحید مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں تمہیں تمہارے دفتر سے پک کر لوں گا۔“

”کس وقت؟“ وحید نے تھکی ہوئی آواز میں پوچھا۔ پھر فوراً خود ہی بتایا۔ ”آج کل دفتر میں کام بہت ہے۔ دیر سے ہی اٹھنا ہوتا ہے کیا کوئی بہت ضروری بات ہے؟“

”بہت ضروری۔ ورنہ میں تم سے اصرار نہ کرتا۔“

دوسری طرف سے چند لمحے خاموشی رہی پھر وحید نے کہا۔ ”ٹھیک ہے نوبے میرے دفتر آجاؤ۔ رات کا کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔“

”اوکے۔ اس دوران میں بھی کوشش کروں گا کہ کچھ کام نمٹا لوں۔“ عمران نے کہا۔

چار بجے عمران نے گھر فون کیا۔ ثبوت نے اس کی بات نہ ہو سکی۔ وہ ہاتھ روم میں تھی۔ ”تم بی بی کو بتا دینا کہ آج مجھے واپسی میں بہت دیر ہو جائے گی۔ کام بہت زیادہ ہے۔ رات کا کھانا بھی میں باہر ہی کھاؤں گا۔ ان سے کہنا کھانے پر میرا انتظار نہ کریں۔“ عمران نے زیو کو بتایا۔

”کس وقت تک آئیں گے صاحب؟“ زیو نے پوچھا۔

”گیارہ تو بج ہی جائیں گے اور دیر ہو سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔ میں باجی کو بتا دوں گی۔“

عمران نے ریسپور رکھا اور کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس روز کام میں کچھ اس کا دل بھی لگ رہا تھا۔ وہ کام کرتا رہا۔ پانچ بجے اس نے شاہدہ کو چھٹی دے دی۔ ”آپ چلی جائیں مس شاہدہ۔ میں آج دیر تک کام کروں گا۔“

نوبے تک مہلت کافی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس وقت تک کم از کم ایک اکاؤنٹ کا کام تو خوش اسلوبی سے نمٹا ہی لے گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ساڑھے پانچ بجتے والے تھے کہ وحید آگیا۔ اسے دیکھ کر عمران کو حیرت ہوئی۔ ”اتنی جلدی آگئے تم؟“

”بس یار، تمہاری قسمت اچھی تھی۔ موقع مل ہی گیا۔ اب تم رات کے کھانے سے توجہ ہی گئے۔ ورنہ بل کی صورت میں تمہاری کھال اتر دیتا میں۔“

”اس کی فکر کسے ہے۔ کھانا تو ہم اب بھی ساتھ کھا سکتے ہیں۔“ عمران نے کہا۔

”خیر یہ بتاؤ اب کیا ارادہ ہے؟“

جائیں۔“

”بہت کچھ ایسا ہوتا ہے، جو بظاہر واضح طور پر نظر نہیں آتا ہے لیکن ہوتا برعکس ہے۔“ وحید نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ”تم مجھ سے مشورہ بھی چاہتے ہو؟“

”اسی لئے تو اتنی مصروفیت میں تمہیں تکلیف دی ہے۔“

”میں تمہیں یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ بھالی کو یہ سب کچھ بتادو۔ حقیقت تمہیں معلوم ہو جائے گی۔ بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔“

”لیکن.....“

وحید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بھائی میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد ہی اعتماد پر ہوتی ہے۔ اعتماد نہیں تو سب بے کار ہے۔ تمہیں پہلے ہی انہیں بتا دینا چاہئے تھا۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ تھوڑا بہت ناراض تو وہ ہوں گی۔ میری رائے میں بس یہی ایک حل ہے اس کا۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔“ عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

بل ادا کر کے وہ ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ اس وقت آٹھ بجے تھے۔ عمران نے وحید سے کھانے کا پوچھا لیکن وحید نے منع کر دیا۔

عمران نے وحید کو گلشن اقبال میں اس کے گھر ڈراپ کیا۔ اپنے گھر جاتے ہوئے وہ فکر مند تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شینہ کا سامنا کیسے کرے گا۔ اسے یہ سب کچھ کیسے بتائے گا اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس گفتگو کے بعد اس کی ازدواجی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائے۔

لیکن اگر اس کے شہادت درست ہوئے تو.....

اپنی اس سوچ پر اسے شدت سے غصہ آیا۔ اس نے سوچا، یہ واقعتاً ضروری ہے کہ وہ شینہ سے بات کر لے۔ خواہ اس کے نتیجے میں ذلیل ہونا پڑے۔ یا برباد۔ شک اس کے دل میں اتنی جگہ بنا چکا ہے کہ وہ شک کرنے سے باز رہ ہی نہیں سکتا۔

فوراً ہی اس کے شب کی کمینگی کی ایک اور مثال سامنے آگئی۔ اگرچہ فوری طور پر وہ اسے سمجھ سکا۔

اپارٹمنٹ بلڈنگ میں گاڑی پارک کرنے کی کہیں جگہ نہیں تھی۔ اس لئے اس نے گاڑی بہت پہلے امی کے گھر ہی چھوڑ دی تھی اور خود موٹر سائیکل پر آتا جاتا تھا۔ اس روز

عمران بالکل ابتدا سے سب کچھ سنا رہا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ کوئی معمولی بات بھی بیان سے نہ رہے خواہ وہ اس کے نزدیک غیر اہم ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے ڈاکٹر سے کچھ بھی نہیں چھپانا چاہئے، ویسے ہی کسی کو راز دار بناتے وقت یہ اہتمام رکھنا پڑتا ہے۔

وحید کے چہرے پر محویت کا تاثر تھا۔ وہ بڑی توجہ سے عمران کی باتیں سن رہا تھا۔ کئی بار اس کی آنکھوں میں حیرت جھلکتی نظر آئی تھی، کبھی وہ تاسف سے سر ہلاتا رہا تھا۔ کم از کم اسے تو ٹیلی فون پر سنی جانے والی وہ اتفاقیہ گفتگو پر یوں کی کہانی ہی لگ رہی تھی۔

”تو یہ ہے صورت حال۔“ عمران نے سب کچھ بتانے کے بعد آخر میں کہا۔ ”اگر یہ سب کچھ یونہی چلتا رہا تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اس سے خراب بات یہ ہے کہ میرا کام بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ جلد ہی کوئی بہتری نہ ہوئی تو میرا کیریئر ہی تباہ ہو جائے گا۔“

”اسی لئے تم یہ سب کچھ مجھے بتانے پر مجبور ہو گئے۔“ وحید نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں، مگر بات صرف بوجھ ہلکا کرنے کی نہیں۔ مجھے تمہاری رائے اور مشورے کی بھی ضرورت ہے۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔“ وحید نے کہا۔ ”میری رائے میں غلطی سراسر تمہاری ہے اور تمہیں اس بات کا احساس بھی ہے اسی لئے تم نے اس سلسلے میں کسی سے بات نہیں کی۔ بلکہ گریز کرتے رہے۔“

”یہ بات نہیں۔“ عمران کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ”مجھے تو شینہ کی عزت کا خیال تھا۔ یہ تو بڑی شرم ناک بات۔“

”تم خود بھالی نے اس سلسلے میں بات کر سکتے تھے۔“ وحید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بہر حال میری رائے میں تمہیں خود یہ یقین ہے کہ شینہ بھالی ایسی نہیں ہیں۔ ورنہ تم ان سے ضرور بات کرتے۔ تمہیں ڈر تھا کہ تم ان کی نظروں میں گر جاؤ گے۔ کیونکہ اس بات میں صداقت نہیں۔“

”لیکن غور تو کرو۔ اتفاقات ہوتے ہیں لیکن ایسا تو نہیں ہوتا کہ یوں کڑیاں ملتی

اس نے موٹر سائیکل بلڈنگ سے کچھ دور روک دی۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے لیکن وہاں رونق بالکل نہیں تھی۔ وہ موٹر سائیکل گھسٹتا ہوا زینے تک پہنچا جہاں ہر روز موٹر بائیکر کھڑی کرتا تھا۔

موٹر سائیکل لاک کر زینے پر قدم رکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ پھر ٹینے پر شک کر رہا ہے۔ اس نے فون پر کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے کے بعد ہی گھر پہنچے گا۔ یعنی وہ تین گھنٹے پہلے گھر آگیا ہے اور اب وہ چپکے چپکے گھر کی طرف جا رہا ہے کیا اس امید پر کہ.....؟

اس سے آگے اس سے سوچا ہی نہیں گیا۔ وہ پہلے ہی اتنا مطعون ہو چکا تھا۔ وحید کے ہاتھوں بھی اور اپنے ہاتھوں بھی اور پھر وہ تو معاملات صاف کرنے کی نیت سے جا رہا تھا۔ یہ شک تو اس کا حوصلہ ہی پست کر دیتا۔ اس شک کو رد کرنے کے لئے اس نے تیزی سے جواز گھڑا۔

وہ تو بس ٹینے کو سربراہز دینا چاہتا ہے۔

☆=====☆=====☆

لیکن سربراہز تو صرف اسی کے لئے تھا!

اس نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ جواب میں بہت بہت زیادہ ہلکی سی قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ چاپ ہی ہے وہ اس کا وہم بھی ہو سکتا تھا۔

اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ اس بار بھی دروازہ نہیں کھلا۔ یہ احساس ضرور ہوا کہ ہیپننگ گلاس سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔

شک کے کن کھجورے نے اس کے دماغ میں پنچے گاڑ دیئے۔ اس کے اندر جیسے آگ سی بھڑک اٹھی۔ دروازہ کھلنے میں اتنی دیر! اس کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ وہ لمحے اس کے لئے بے حد اذیت ناک تھے۔ اطلاعی گھنٹی کے بٹن پر اس کی انگلی جم کر رہ گئی۔

اچانک دروازہ کھلا اور ٹینے کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ وہ بہت سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں میں خوف تھا اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو جیسے وہ اسے اندر آنے سے منع کر رہی ہو۔

لیکن عمران اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اور بھڑک گیا وہ اسے دھکا دیتے ہوئے آندھی

کی طرح اندر داخل ہوا۔ ”کون ہے گھر میں؟ کون ہے؟“ وہ غرایا لیکن اندر داخل ہوتے ہی وہ پتھر کے بت کی طرح ساکن ہو گیا۔ وہ اپنا جملہ پورا بھی نہ کر سکا۔

سب سے پہلے اس کی نظر ریوالور کی نال پر پڑی جو اتنے کم فاصلے سے خوف ناک حد تک بڑی نظر آ رہی تھی۔ جیسے توپ کا دہانہ ہو۔

”اب دروازہ بند کر کے لاک کر دو خاتون۔“ ایک غراہٹ سنائی دی۔

ٹینے نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ بند کر دیا۔

اب عمران نے اس شخص کو دیکھا، جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کا قد کچھ اس سے نکلتا ہوا تھا۔ چہرے پر اس نے رومال باندھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ آنکھوں پر رنگین شیشوں کا چشمہ تھا۔ ہر لحاظ سے وہ بے چہرہ آدمی لگ رہا تھا۔ یہ بات اس کی خوف ناکی میں اور اضافہ کر رہی تھی۔

اور یہ سب کچھ خواب نہیں، حقیقت تھا اور حقیقت بہت خوف ناک تھی۔

”اب کیا رات بھر بیس کھڑے رہو گے اندر چلو۔“ بے چہرہ آدمی نے درشت لہجے میں کہا۔ وہ انگلی سے ٹی وی لائونج کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ٹینے نے عمران کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ ”زیو کے دروازہ کھولتے ہی یہ لوگ اندر گھس آئے تھے۔“ اس کی آواز میں بھی لرزش تھی۔

”میں کہتا ہوں، اندر چلو.....“ بے چہرہ آدمی پھر غرایا۔

ٹینے اور عمران مرے مرے قدموں سے ٹی وی لائونج کی طرف چل دیئے۔ ”کتنی دیر ہوئی انہیں آئے ہوئے؟“ عمران نے سرگوشی میں ٹینے سے پوچھا۔

”مشکل سے پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔“ ٹینے نے کہا۔ پھر رونے لگی۔ ”اب کیا ہو گا عمران؟“

عمران کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا مگر اس نے ٹینے کو دلاسا دیا۔

”پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اتنی دیر میں وہ ٹی وی لائونج میں پہنچ چکے تھے۔ عمران نے دیکھا، لائونج میں تین بے چہرہ آدمی اور تھے۔ وہ زیب النساء کو گھیرے ہوئے تھے۔ عمران اور ٹینے کو لانے والے نے عمران اور ٹینے کو بیٹھنے کو کہا پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”یہ ہے سربراہ مملکت۔“ اشارہ عمران کی طرف تھا۔ اس پر لائونج میں موجود تینوں ڈاکوؤں نے قمقمے

لگائے۔

عمران اور ثمنہ بھی بیٹھ گئے تھے۔ ”تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“ عمران نے ہمت کر کے پوچھا۔ اب وہ سب کچھ اسے غیر حقیقی، خواب سا لگ رہا تھا۔

”اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے۔ بہت بے وقوف معلوم ہوتے ہو۔“ لارنج میں موجود ڈاکوؤں میں سے ایک نے تبصرہ کیا۔ ”بھئی یہاں ہم دعوت کھانے تو نہیں آئے ہیں۔ ہمیں مال چاہئے اور مال بھی ایسا کہ جگہ کم گھیرے اور قیمتی زیادہ ہو۔“

عمران کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔ جبکہ جواب اسے معلوم تھا۔ اس نے سرگھما کر چاروں ڈاکوؤں کو دیکھا۔ ان میں سے تین کے ہاتھوں میں ریوالتور تھا۔ جبکہ چوتھے کے ہاتھ میں کلاشنکوف ٹائپ کی کوئی گن تھی۔ یہ چوتھا وہی تھا جس نے ابھی اس کے سوال پر جوابی تبصرہ کیا تھا۔ وہی سردار معلوم ہوتا تھا۔

”اب کیا پروگرام ہے چیف؟“ ڈاکوؤں میں سے ایک نے کلاشنکوف والے سے پوچھا۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ سردار ہے۔

”ابھی بتاتا ہوں۔“ چیف نے کہا اور ثمنہ کی طرف مڑا۔ ”خاتون میں جانتا ہوں کہ عورتوں کے لئے زیورات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ تمہارے لئے بھی زیورات سے دستبردار ہونا آسان نہیں ہو گا مگر یہ حقیقت ہے کہ زیورات تو جب چاہو گی خرید لو گی۔ زندگی چھین گئی تو دوبارہ نہیں ملے گی اور شاید تمہیں یہ اندازہ بھی ہو گا کہ بیوہ کی زندگی بھی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔“ اس کے نرم لہجے میں بے حد خوف ناک دھمکی تھی۔

ثمنہ کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک ڈاکو اپنے سردار سے مخاطب ہو گیا۔ ”چیف، ابھی تم نے دعوت کی بات کی تھی۔“

”میں نے کہا، ہم یہاں دعوت کھانے تو نہیں آئے ہیں۔“ چیف نے سخت لہجے میں کہا۔

”لیکن چیف، بھوک بھی لگ رہی ہے اور کھانے کا وقت بھی ہے تو پھر دعوت ہی سی۔“

چیف کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس سے پہلے ایک اور ڈاکو بول پڑا۔ ”ویسے بھی اتنی جلدی فلیٹ سے نکلنا ٹھیک نہیں ہو گا چیف۔ آدھی رات کے بعد ہی نکلنا بہتر رہے گا۔“

”اور یہاں وی سی آر اور ٹی وی موجود ہے۔“ چوتھا ڈاکو بولا۔

چیف کچھ دیر سوچتا رہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا پھر وہ ثمنہ سے مخاطب ہوا۔ ”خاتون یہ کھانے کا وقت ہے کھانا تو تیار ہو گا؟“

”نہیں کھانے کو تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”کیوں تمہارے گھر میں کھانے کا رواج نہیں ہے۔ کھانا نہیں پکتا؟“

”انہوں نے فون کر کے بتایا تھا کہ دیر سے گھر آئیں گے اور کھانا باہر ہی کھائیں گے۔“ ثمنہ نے عمران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کھانا نہیں پکایا۔ سوچا میں اور زیو دوپہر کا چائہ پکچا ہوا ہی کھالیں گے۔“

”بہر حال اب تو تمہارے صاحب جلدی گھر آگئے ہیں۔ جلدی سے ان کے لئے کھانا لگاؤ اور ہمارے لئے بھی اور ذرا ڈھنگ سے پکانا۔ ہم کھانے کے معاملے میں بہت خوش ذوق ہیں۔ اب تم اور یہ ملازمہ دونوں کچن میں جاؤ۔ جلدی کرو۔“

ثمنہ اور زیو کچن میں جانے کے لیے اٹھنے لگیں تو چیف نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ ”بی ون تم بھی کچن میں جاؤ۔ ان پر نظر رکھنا۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ عمران نے احتجاج کیا۔ ”تمہیں ان دونوں سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔“

”سنو اس گھر کے پرائم فکٹر صاحب۔“ چیف نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مانا کہ یہاں تمہارا حکم چلتا ہے لیکن یہ نہ بھولو کہ اس وقت میں اس جگہ کا صدر ہوں اور یہ میرے ہاتھ میں آٹھویں ترمیم کا ہتھیار دیکھ رہے ہو۔ میں تمہیں تمہاری اسمبلی سمیت ڈالوا کر سکتا ہوں۔ لہذا مجھ سے الجھنے کی کوشش مت کرنا۔“ اس نے کلاشنکوف لہرائی۔ ”بی ون تم دونوں عورتوں کے ساتھ جاؤ۔ ان پر نظر رکھنا ضروری ہے۔“

ثمنہ اور زیو کچن میں چلی گئیں۔ بی ون نے ایک کرسی لے جا کر کچن کے دروازے پر رکھی اور اس پر بیٹھ گیا۔

”اب چیف کوئی فلم ہو جائے۔“ ایک اور ڈاکو نے چیف سے فرمائش کی۔

چیف عمران کی طرف مڑا۔ ”ویڈیو فلمیں ہیں تمہارے پاس؟“

عمران نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ٹی وی ٹرالی کی دراز کی طرف اشارہ کیا۔ ”بی نو، کوئی فلم پسند کر لو اور لگا دو۔“ چیف نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

عمران نے سوچا تیسرا یقینانی تھری ہو گا۔

بی نو نے فلم لگا دی۔ وہ لوگ سکون سے بیٹھ کر فلم دیکھنے لگے بی ون بھی بی ون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بی ونی لاؤنج کی سینک ایسی تھی کہ کچن میں رہتے ہوئے بھی بی ونی دیکھا جاسکتا تھا۔ یہ آسانی اس وقت بی ون کے کام آ رہی تھی۔ اس نے سرگھما کر ٹینہ اور زیبو کو دیکھا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں تم پر نظر رکھے ہوئے ہوں گزبہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ شوٹ کرنے میں صرف ایک سیکنڈ لگے گا مجھے۔“

عمران کو ان کی دیدہ دلیری پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ ایک گھر میں ڈاکے کے ارادے سے گھے تھے۔ انہیں کوئی خوف نہیں تھا اور اب وہ گھر کے لوگوں کی طرح بیٹھے بی ونی پر فلم دیکھ رہے تھے۔ کھانا پکانے کا حکم بھی دے چکے تھے اور یہ طے تھا کہ کھانا وہ ڈٹ کر کھائیں گے۔ ممکن ہے کھانے کے بعد سویٹ ڈش کی فرمائش بھی کریں۔

بچت کی کوئی صورت، کوئی امکان نہیں تھا۔ ڈاکوؤں کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ صرف زیورات اور نقدی پر اکتفا کریں گے۔ نقدی گھر میں زیادہ تھی ہی نہیں۔ البتہ ٹینہ کے پاس جیولری بہت قیمتی بھی تھی اور زیادہ بھی تھی۔ یہ نقصان یقیناً بھاری ہونے والا تھا لیکن یہ بھی سچ تھا کہ زندگی کے مقابلے میں اس نقصان کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ عمران کو وہ سب کچھ حقیقی نہیں لگ رہا تھا۔ اسے تو وہ اپنا بنایا ہوا وٹو کولا کا کمرشل لگ رہا تھا ابھی وہ لوگ فریج کھولیں گے وٹو کولا نکال کر پیئیں گے اور شکریہ ادا کر کے رخصت ہو جائیں گے لیکن دماغ کے اندر کہیں بہت گہرائی میں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ بہت خطرناک صورت حال ہے جس میں کسی بھی لمحے کوئی خوفناک واقعہ پیش آسکتا ہے بلکہ پیش آئے گا۔ اس کے علاوہ کوئی بات کوئی جانی ہوئی، سبھی بوجھی بات اس کے ذہن میں چھ رہی تھی لیکن اس کا ذہن اسے گرفت میں نہیں لے پا رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اس وقت کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ دھند میں جکڑے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ ڈاکو فلم پر تبصرے بھی کر رہے تھے اور ہنسی مذاق بھی۔ عمران کے فلم دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ کبھی کچن کے دروازے پر بی ون کو دیکھتا اور کبھی دوسرے ڈاکوؤں کو۔ اس صورت حال میں کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی قوت متخیل بھی بے برگ و بار ہو کر رہ گئی تھی۔

یونہی وقت گزرتا رہا لیکن اس کی رفتار بہت سست تھی۔ کم از کم عمران کے لئے اور

اس گزرتے ہوئے وقت نے اسے اور شل کر کے رکھ دیا۔ کچھ کرنے کی پوزیشن میں تو وہ پہلے ہی نہیں تھا مگر اب سوچنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وہ جو بات اس کے ذہن میں رہ رہ کر چھ رہی تھی اب اس میں اس کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ وہ یوں بیٹھا تھا جیسے جسم بے روح ہو گیا ہو۔

ساڑھے دس بجے کے قریب کھانا تیار ہو گیا۔ بی ون نے وہیں بیٹھے بیٹھے چیف کو اس بات کی اطلاع دی۔ چیف نے بی ون کو فلم روکنے کی ہدایت اور بی ون سے کہا۔ ”خواتین سے کہو، کھانا لگا دیں۔ کھانا ہم بیٹیں کھائیں گے۔“

زیبو نے کھانا لگا دیا۔ وہ چاروں کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تینوں ڈاکوؤں نے اپنے ریوالور میز پر اپنے سامنے رکھ لئے۔ چیف نے اپنی گن اپنی رانوں پر رکھ لی۔ ”تم تینوں سامنے بیٹھ جاؤ۔ یاد رکھو، ایک غلط حرکت کا مطلب تینوں کی موت ہو گا۔ بعد میں تم تینوں بھی کھانا کھا سکو گے۔“

ان تینوں کو کھانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ”ہمیں بھوک نہیں لگ رہی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”تمہاری مرضی۔“

چاروں ڈاکوؤں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد چیف نے ان تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اب جسے بھوک ہو وہ کھالے۔“

عمران اور ٹینہ نے نفی میں سر ہلایا۔ زیبو نے بھی ہچکچاتے ہوئے نفی میں سر ہلادیا۔ وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ یہ طے تھا کہ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ اس وقت تک گیارہ بج چکے تھے۔ ٹینہ نے اس کا حال دیکھا تو کہا۔ ”زیبو، تم جا کر کچن میں ہی کھانا کھاؤ۔“

زیبو نے دوبار انکار کیا مگر پھر اٹھ گئی۔ چیف نے ٹینہ سے پوچھا۔ ”خاتون، تم کھانا نہیں کھا رہیں؟“

”نہیں!“ ٹینہ نے مختصر کہا۔

”تو پھر جا کر ہمارے لئے چائے بناؤ۔“

”زیبو، اپنا کھانا نکالنے سے پہلے چائے کے لئے پانی چولہے پر رکھ دینا۔“ ٹینہ نے زیبو سے کہا۔ ”تمہارے کھانا کھاتے کھاتے چائے تیار ہو جائے گی۔“

”آپ اکیلی تو نہیں ہوں گی۔ بی ٹو اور بی تھری آپ کے ساتھ ہوں گے۔“
 عمران اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ اس نے شینہ سے کہا۔
 چیف کا گن والا ہاتھ بہت تیزی سے حرکت میں آیا۔ گن کی نال عمران کے رخسار پر لگی۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ہاتھ مضروب رخسار پر تھا۔
 اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے خون نکلا۔

شینہ اس پر جھک رہی تھی کہ بی ٹو نے شینہ کو پکڑ لیا۔ ”کیوں شوہر کی دشمن ہوئی ہو خاتون۔ اسے تمہاری مدد اور دیکھ بھال کی ضرورت نہیں۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ تم ہم سے تعاون کرو۔“

عمران خون تھوک رہا تھا۔ شینہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور دونوں ڈاکوؤں کے ساتھ بیڈ روم کی طرف چل دی۔

”کوئی کمر، کوئی الماری نہیں چھوڑنا۔“ چیف نے اپنے جاتے ہوئے ساتھیوں کو لاکار۔ ”بار بار زحمت دینا ٹھیک نہیں۔ پہلی بار میں ہی سب کچھ نمٹا لو۔“
 ”تم بے فکر رہو چیف۔“ بی ٹو نے پلٹ کر جواب دیا۔

ان کے جانے کے بعد چیف عمران کی طرف متوجہ ہوا۔ ”سوری مسٹر پرائم مسٹر۔“
 اس نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن میں تمہیں پہلے ہی دو بار سمجھا چکا ہوں۔ میں اپنے کاموں کے درمیان مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اس لئے تمہیں سبق دینا ضروری تھا۔“

عمران نے کچھ نہیں کہا۔ اس سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا لیکن اسے یہ احساس بھی تھا کہ اسے چوٹ زیادہ نہیں لگی ہے۔

وقت چوٹی کی رفتار سے ریگلتا رہا۔ جانے کتنی دیر بعد بی ٹو اور بی تھری شینہ کو لئے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک گٹھری تھی۔ انہوں نے گٹھری چیف کی طرف بڑھادی۔
 ”یہ لو چیف۔“

چیف نے گٹھری کھول کر جائزہ لیا اور طمانیت سے سر ہلایا۔ ”زیور تو کافی ہیں۔ نقدی کی تلافی ہو گئی۔ اچھی طرح ایک ایک جگہ دیکھ لی ہے نا؟“

”لیس چیف۔ بس ایک کمرہ گیا ہے۔ اس میں لوہے کی ایک الماری ہے۔ خاتون کہتی ہیں کہ وہ ان کے شوہر کا کام کا کمرہ ہے اور اس کی الماری کی چابی ان کے پاس نہیں

”نہیں خاتون، چائے بھی ہم تمہارے ہی ہاتھ کی پیس گے۔“ چیف نے کہا۔
 ”تمہیں چائے سے مطلب ہے یا.....“ عمران نے تیز لہجے میں کہنا چاہا۔

جواباً چیف نے گن لہرائی۔ ”مسٹر عمران، میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ مجھے آٹھویں ترمیم استعمال کرنے پر مجبور مت کرو۔ یہ میں بہتر جانتا ہوں کہ مجھے کیا چاہئے۔“
 سسمی ہوئی شینہ اٹھی اور کچن کی طرف چل دی۔ عمران کی سمجھ میں اب چیف کے جملے کی اہمیت آرہی تھی۔ چیف نے اسے مسٹر عمران کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ اس کے نام سے واقف تھا۔ کیسے؟ اس سوال کا جواب اس کے ذہن نے مضحل ہونے کے باوجود بہت تیزی سے دیا۔ کسی بھی واردات سے پہلے ڈاکو گھر کے اور گھر کے لوگوں کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں ان کے معمولات کا بھی پورا علم ہوتا ہے۔

”چیف فلم ادھوری رہ گئی۔“

عمران نے چونک کر دیکھا۔ بی ٹو چیف سے مخاطب تھا۔
 ”پہلے کام نمٹالیا جائے پھر موقع ہوا تو فلم بھی دیکھ لیں گے۔“ چیف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

چائے آگئی۔ ان چاروں نے جلدی جلدی چائے پی۔ چائے پیتے ہوئے چیف نے اچانک شینہ سے کہا۔ ”ہاں خاتون، تفریح تو بہت ہو چکی۔ اب ذرا کام کی باتیں ہو جائیں۔ میں آپ سے زیورات اور نقدی کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔“
 ”نقدی تو ہمارے ہاں زیادہ نہیں ہے۔“ شینہ نے جواب دیا۔ ”بس چار ساڑھے چار ہزار روپے بڑے ہوں گے۔“

”کافی ہیں گزارہ ہو جائے گا۔ آپ ایسا کریں۔ تمام الماریوں، تجویروں اور درازوں کی چابیاں نکال دیں۔“

شینہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔

”بی ٹو اور بی تھری، تم ایسا کرو خاتون کے ساتھ جاؤ اور کام کی ہر چیز سمیٹ لو۔“
 وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے لیکن شینہ بدستور اپنی جگہ کھڑی تھی۔

”کیا بات ہے خاتون جائیں نا آپ۔“ چیف نے سخت لہجے میں کہا۔
 ”مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔“

ہے۔" بی نو نے عمران کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کام کا کمر ہے تو اس میں کام ہوگا۔" چیف نے کہا۔ "اور ہمیں کام نہیں چاہئے۔" اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ بارہ بجتے والے تھے۔ "میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے نکل لینا چاہئے۔"

"ٹھیک ہے چیف....."

اچانک چیف کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں چمک اُبھری۔ اس نے عمران سے کہا۔ "تم ذرا میرے ساتھ اپنے کام والے کمرے میں چلو۔" عمران نے چونک کر اسے دیکھا۔ "وہاں کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ تم بس اٹھ جاؤ۔" چیف نے کہا پھر اپنے ساتھیوں سے بولا "تم دونوں عورتوں پر نظر رکھنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

عمران اسے اسٹڈی میں لے گیا لیکن ان چند لمحوں میں اس پر سب کچھ روشن ہو گیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ جو بات بہت دیر سے رہ رہ کر اس کے ذہن میں چھ رہی تھی۔ وہ گرفت میں آگئی تھی اور وہ خیال بہت خوف ناک تھا۔ اس واردات کا تعلق اس کو اس ٹاک سے تو نہیں، جو اس نے شادی سے پہلے فون پر سنی تھی؟ اس خیال کے ساتھ ہی اسے اپنے روٹنے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس خیال کے ساتھ ہی سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ پہلے وہ ذہنی کی ایک عام سی واردات تھی جس میں متحمل مزاجی کی صورت میں کسی کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ ڈاکوؤں کو لوٹنا تھا اور چلے جانا تھا مگر اب یہ ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔ اس کا مقصد..... عمران کو راستے سے ہٹانا تھا۔ واردات میں جو کچھ مل رہا تھا وہ تو محض بونس تھا۔

کسی سنگین بحران میں انسان کا دماغ، جسم اور اعصاب سب شل ہو جاتے ہیں مگر موت کا خطرہ لاحق ہو جائے تو انسان کے تمام حواس الرٹ ہو جاتے ہیں۔ یہی کچھ عمران کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے دماغ پر چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی۔

"پھر وہی بدگمانی، وہی شک....." اس کے ذہن نے احتجاج کرنا چاہا لیکن اس نے ذہن کو جھڑک دیا۔ "شٹ اپ۔ اس بار میرے پاس ثبوت ہے۔ چیف کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔ یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہو رہا ہے۔"

ذہن جوابی دلیل دینا چاہتا تھا لیکن عمران کچھ سننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چیف اسے اسٹڈی میں کیوں لے جا رہا ہے جبکہ اسٹڈی میں کوئی کام کی چیز نہیں ہے یقیناً وہاں وہ اسے مزاحمت کے نام پر قتل کرے گا۔ یقیناً یہی بات ہے ورنہ اس کی آنکھوں میں چمک کیوں ابھری تھی۔

وہ اسٹڈی میں پہنچ چکے تھے لیکن عمران کو اس کا احساس نہیں تھا۔ "اس کینٹ کی چابی نکالو اور اسے کھولو۔" چیف نے اسے چونکا دیا۔

عمران میز کی طرف بڑھ گیا۔ میز کی دراز سے اس نے آہنی کینٹ کی چابی نکالی۔ اس دوران وہ کچھ کرنے کے امکانات پر غور بھی کرتا رہا لیکن یہ سب کچھ محض تخیل میں آسان لگتا ہے۔ وہ تو ویسے بھی عملی آدمی نہیں تھا۔ موت سر پر کھڑی ہو تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے مگر یہاں مقابلہ خود کارگن سے تھا جو ایک سیکنڈ میں ان گنت گولیاں اس کے جسم میں اتار سکتی ہے۔ ایسے میں کچھ کرنا خود کشی ہی کہلا سکتا ہے۔ کچھ کر کے وہ چیف کو جواز ہی فراہم کرے گا۔

انہی خیالات میں الجھا وہ کینٹ تک پہنچ گیا۔ چیف میز پر کھڑا میز پر رکھے کانڈات کو دیکھ رہا تھا لیکن عمران جانتا تھا کہ وہ ساتھ ہی اس پر نظر بھی رکھے ہوئے ہے۔ چیف نے میز پر رکھے ایک لفافے میں سے کانڈ نکالا اور اس کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"مسٹر عمران، الماری کھولنے کی ضرورت نہیں۔" چیف نے اچانک پکارا۔ عمران ٹھنک گیا۔ "یہاں آؤ اور سکون سے بیٹھ جاؤ۔" چیف نے کاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔

عمران کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ پلٹا اور کاؤچ پر جا بیٹھا۔ چیف نے میز کے سامنے والی کرسی سنبھال لی تھی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی موٹی مرگی ہو۔" چیف نے کہا۔ "تم تو ہمارے لئے خوش قسمتی کا نشان ثابت ہو رہے ہو۔"

"میں سمجھا نہیں۔" عمران منمنایا۔

"کون سوچ سکتا ہے کہ تمہارے بینک اکاؤنٹ میں دس لاکھ سے اوپر رقم ہوگی۔" چیف نے لفافے سے نکالا ہوا کانڈ لہراتے ہوئے کہا۔

عمران نے غور سے کانڈ کو دیکھا اور ایک نظر میں پہچان گیا۔ وہ بینک اکاؤنٹ کا سہ ماہی گوشوارہ تھا۔ ایک لمحے کو اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا مگر پھر جیسے اس کے اندر امید

کی توانائی دوڑ گئی۔ اب چیف اسے مار نہیں سکتا تھا۔ وہ دس لاکھ روپے تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

”چلو، نقدی بھی مل گئی۔“ چیف خود کلائی کے انداز میں بڑبڑایا۔ ”آؤ دوست۔ اب واپس چلیں۔“ اس نے عمران سے کہا۔ ”اب تو ہمیں قیام کرنا پڑے گا۔“ اس بارٹی وی لاؤنج کی طرف جاتے ہوئے عمران کے قدموں میں اعتماد تھا۔ ”ساتھیو..... ایک بہت بڑی خوش خبری ہے تمہارے لئے۔“ ٹی وی لاؤنج میں چیف نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہاں دس لاکھ کی رقم بھی موجود ہے۔“ اس کے ساتھی بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔ ”سچ چیف؟“ بی ون نے کہا۔ ”کہاں ہے؟“

”بینک میں۔“ چیف نے بڑے سکون سے کہا۔ یہ سن کر ٹینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے اس رقم کے بارے میں علم ہی نہیں تھا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“ بی ون نے چیف سے پوچھا۔ ”رقم ملنے تک ہمارا بیس قیام رہے گا۔“ چیف نے کہا۔ ”بی تھری اور بی ٹو سوجائیں گے، تم اور میں رات بھر ان پر نظر رکھیں گے۔ باری باری۔ اس وقت ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ پہلے چار گھنٹے تم سوجاؤ، پھر میں سوجاؤں گا۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم سب کو جگا دیتا۔“

”لیکن ہو گا کیا؟“ ”بی تھری مسٹر پرائم منسٹر کے ساتھ بینک جائے گا اور رقم نکلوا کر لائے گا۔ اس لئے اس کی نیند پوری ہونا ضروری ہے۔“ ”اور بی ٹو؟ اس کے جاگنے کی ڈیوٹی کیوں نہیں لگ رہی ہے؟“ بی ون نے اعتراض کیا۔

”اس سے مجھے ایک اور کام لینا ہے۔“ ”لیکن ان صاحب کا ساتھ جانا بھی ضروری تو نہیں۔“ بی ون نے عمران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چیک تو بی تھری بھی کیش کرا سکتا ہے۔“ ”تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ دس لاکھ کا چیک ہو گا۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے

سکتا۔“ ”تو پھر اکیلے عمران کو بھیج دو۔ اس کی بیوی تو ہمارے رحم و کرم پر ہوگی۔ یہ کوئی گزربز نہیں کر سکتا۔“

”ہرگز نہیں۔ دس لاکھ روپے میں تو چار شادیاں ہو سکتی ہیں۔“ چیف نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”دس لاکھ کا معاملہ ہو تو ایک پرانی بیوی کی پروا کون کرتا ہے۔“ عمران نے ٹینہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا لیکن عمران اب مطمئن تھا۔ یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ جان کا خطرہ صرف اسے لاحق ہے۔ ٹینہ کو وہ لوگ کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔ اس لئے کہ اسے حاصل کرنے کے لئے ہی تو یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے اور چیف کے کیم پلان کے مطابق اسے باہر نکلنے کا موقع ملے گا۔ باہر اس طرح کا کوئی موقع ملنا اتنا مشکل بھی نہیں۔

☆=====☆=====☆

کہتے ہیں کہ نیند پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے! عمران کو اس محاورے پر یقین آگیا۔ رات نہ جانے کس وقت نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ صوفے پر ہی ڈھیر ہو گیا تھا اور وہ بے سدھ سویا تھا۔ درمیان میں ایک بار بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی اور اب کوئی جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اسے اٹھا رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ لباس کی وجہ سے اس نے بی ون کو پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے سب کچھ یاد آگیا اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ ایک صوفے پر ٹینہ اور دوسرے پر زیبو بے خبر سو رہی تھی۔

”اٹھو اور اس طرح تیار ہو جاؤ جیسے دفتر کے لئے تیار ہوتے ہو۔“ بی ون نے اسے حکم دیا۔

عمران اٹھ کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔ ہاتھ روم سے نکلتے ہوئے اسے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے رات کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ویسے بھوک لگنا بے حد خوش آئند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے واقعتاً بہتری کی امید ہے۔

وہ باہر نکلا تو بی ون اپنے تمام ساتھیوں کو جگا چکا تھا۔ ٹینہ اور زیبو اب بھی سو رہی تھیں۔ ”کپڑے بدلو اور تیار ہو جاؤ۔“ چیف نے تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔ ”اس سے پہلے میں ناشتہ کروں گا۔“ عمران نے کہا۔

”ناشتے کو بھول جاؤ۔ ہم لوگ یہاں مستقل طور پر قیام کرنے کے لئے نہیں آئے ہیں۔“

”لیکن میں ناشتے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔“ عمران کے لہجے میں قطعیت تھی۔ چیف تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ اس نے عمران کے بدلے ہوئے انداز کو سمجھ لیا تھا اور یہ بھی جان لیا تھا کہ اس کے پاس دس لاکھ روپوں کی مضبوطی ہے۔ اس نے کندھے جھٹک دیے۔ ”ٹھیک ہے ٹینم بیگم کو اور اپنی ملازمہ کو جگالو۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہونے میں ڈیرہ گھنٹا لگا۔ اس دوران چیف بی تھری کو ہدایات دیتا رہا۔ ساڑھے دس بجے عمران بی تھری کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ وہ نیچے آئے تو عمران نے پوچھا۔ ”کیسے چلو گے؟“ اس نے بی تھری کے چہرے کو پہلی بار دیکھا۔ وہ 25 سال کا خوش روجوان تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکو ہے۔

”تمہاری باینک پر۔“ بی تھری نے چیف کا دیا ہوا بریف کیس جھلاتے ہوئے کہا ”لیکن اس سے پہلے ہم ذرا چل قدمی کریں گے۔ میں تم پر کچھ واضح کر دینا چاہتا ہوں۔“ عمران اس کے ساتھ چل دیا۔

”تمہیں یہ تو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ چیف نے تمہارے ساتھ جانے کے لئے میرا انتخاب کیوں کیا ہے۔“ بی تھری نے کہا۔ انداز متفسرانہ نہیں تھا۔ لہذا عمران خاموش رہا ”ایک میں ہی ایسا ہوں کہ بھرے بازار میں کسی کو بھی شوٹ کر سکتا ہوں۔“ بی تھری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے گولی چلانے میں لطف آتا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ مجھے ایسا کوئی موقع نہ دو۔ باینک تم چلاؤ گے میں پیچھے بیٹھا ہوں گا۔ بینک میں بھی یہی پوزیشن ہوگی اور یقین کرو میں بینک میں بھی تمہیں شوٹ کر سکتا ہوں۔“

اس نے وہ سب کچھ اتنی سادگی سے کہا تھا جیسے گھریلو معاملات پر باتیں کر رہا ہوں۔ عمران کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دھڑکتی محسوس ہوئی پھر بھی اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں تمہارے لئے دس لاکھ روپے کا چیک ہوں۔“

”اس بھروسے پر کچھ کرنے بیٹھنا۔“ بی تھری نے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے دس لاکھ روپے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو صرف سنسنی سے لطف اٹھانے کے لئے اس گروپ میں شامل ہوا ہوں۔ کسی کو شوٹ کرنے کا موقع اب تک نہیں ملا ہے مجھے۔ اب دل چاہے تو آزماؤ۔“

عمران کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ اس کے ذہن میں انگریزی زبان کی ایک اصطلاح گونج اٹھی..... ٹریگر پی! ”اب چل دو۔“ بی تھری نے کہا۔ ”اب ہم بینک جائیں گے۔“

☆=====☆=====☆

عمران اور بی تھری کے باہر نکلنے کے دو منٹ بعد بی ٹو بھی فلیٹ سے نکل آیا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے رومال چہرے سے ہٹالیا تھا مگر وہ چشمہ اب بھی لگائے ہوئے تھا۔ وہ بیڑھیاں اتر کر نیچے آیا، جہاں اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے موٹر سائیکل باہر نکالی۔ اشارت کی اور پارک کی طرف چل دیا۔ پارک کے قریب ایک درخت کی اوٹ میں اس نے موٹر سائیکل روک دی۔

وہ بہت نروس تھا۔ چیف نے اسے کوئی خطرناک کام نہیں سونپا تھا۔ بلکہ اس کا کام بہت آسان تھا مگر وہ بہت جلدی گھبرا جانے والا، کمزور اعصاب کا آدمی تھا۔ اس وقت وہ بچتا رہا تھا کہ اس نے گینگ میں شامل ہونے کی ہامی کیوں بھری۔ اگر معاملہ بگڑ گیا اور وہ سب پکڑے گئے تو؟ اس خیال سے ہی اسے ہول چڑھنے لگا مگر اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔

اس کے ذہن نے فوراً اس کی تردید کی۔ پیچھے تو وہ کسی بھی وقت ہٹ سکتا ہے۔ اس وقت بھی وہ آزاد ہے۔ کون اسے روک سکتا ہے؟

اس کے اندر اسی وقت گھر چلے جانے کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا۔ جب کام مشکل نہیں، اس میں کوئی خطرہ بھی نہیں تو کیوں خواہ مخواہ زلزل دکھائی جائے۔ اس خیال سے وہ کم از کم وقتی طور پر ڈٹ گیا۔

تمہیں اپنی پوری توجہ اس کام پر رکھنی چاہئے جو تمہیں سونپا گیا ہے۔ اس نے خود کو ٹورہ دیا۔

☆=====☆=====☆

گیارہ بج کر دس منٹ پر چیف کو ایک خیال نے چونکا دیا۔ ”تمہارے شوہر دفتر سے ٹکی کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟“ اس نے ٹینم سے پوچھا۔

”اب تک صرف ایک بار ایسا ہوا ہے۔“ ٹینم نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”اور اس زمانوں نے دفتر فون کر کے بتادیا تھا کہ وہ نہیں آئیں گے۔“

چیف کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تب فون کرنا ضروری ہے۔ اب یہ کام تمہیں کر ہے۔“

”لیکن.....“

”اس معاملے میں لیکن کی گنجائش نہیں ہے۔“ چیف نے درشت لہجے میں کہا۔

”میں ان سے کہوں گی کیا؟“

”تم کموگی کے عمران کو بہت تیز بخار ہے۔ وہ فون پر بات بھی نہیں کر سکتے۔ آج دفتر نہیں آئیں گے۔“

ثمینہ اسٹڈی میں چلی گئی۔ چیف اس کے پیچھے تھا۔ ثمینہ نے نمبر ملایا۔ عمران کی سیکریٹری سے اس نے وہی سب کچھ کہا جو چیف نے اسے بتایا تھا۔ ریسپور رکھنے کے بعد اٹھ رہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسپور کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا چیف نے اسے روک دیا۔ ”ایک منٹ۔“ اس نے کہا۔ ”یہ کس کا فون ہو سکتا ہے؟“

”میری ساس کا ہو گا یا ای کا ہو گا اور تو کوئی نہیں ہو سکتا۔“ ثمینہ نے کہا۔

گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد چیف نے کہا۔ ”ٹھیک ہے بات کر لیکن محتاط گفتگو کرنا۔ میں گولی چلانے میں تامل نہیں کروں گا۔“

ثمینہ نے ریسپور اٹھایا۔ دوسری طرف عمران کی ای تھیں اور وہ تفصیلی گفتگو کر کے موڈ میں تھیں۔ ثمینہ عجیب مشکل میں پھنس گئی۔ ادھر دردانہ بیگم بات کئے جا رہی تھیں۔ ادھر چیف گن لہرا کر اشارہ کر رہا تھا کہ گفتگو مختصر کی جائے۔ آخر ثمینہ نے دردانہ بیگم سے کہا۔ ”ای..... آپ ہولڈ کریں۔ میں سالن چڑھا کر آئی ہوں۔ ذرا اسے د لوں۔“ پھر اس نے ریسپور پر ہاتھ رکھ کر چیف سے سرگوشی کی۔ ”ای ہمیشہ طویل گفتگو کرتی ہیں۔ میں مختصر کروں گی تو انہیں شک بھی ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے بات کرو لیکن کوشش کرو کہ جلدی پیچھا چھوٹ جائے۔“ چیف نے کہا لیکن وہ کال اس کے بعد بھی بیس منٹ جاری رہی۔

☆=====☆=====☆

موٹر سائیکل چلاتے ہوئے عمران بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ چیک کیش ہونے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا اسے پہلے ہی کرنا تھا اور وہ اس کے لئے پہلا اور آخری موقع تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ

چیک کیش ہونے کے طریق کار سے ہی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

بینک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل ترتیب دے چکا تھا۔ اس کی مضبوطی بس اسی میں تھی کہ اسے ثمینہ کے محفوظ ہونے کا یقین تھا۔ اسے صرف اپنے تحفظ کی فکر کرنا تھی۔ اپنی دانست میں وہ ایک باقاعدہ سازش کا شکار ہوا تھا اور صرف اس کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔

اس نے ونڈو پر چیک پیش کیا۔ ”اکاؤنٹ آپ ہی کا ہے؟“ کلرک نے اس سے پوچھا۔

بی تھری اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ ریوالور جیب میں رکھ کر بھی وہ اسے شوٹ کر سکتا ہے۔ بس بینک کی جیب میں ایک سوراخ ہو گا۔

”جی ہاں، اکاؤنٹ میرا ہی ہے۔ میں خود چیک کیش کرانے آیا ہوں۔“ عمران نے جواب دیا اور پلٹ کر ان صوفوں کی طرف چل دیا جو چیک کیش ہونے کا انتظار کرنے والوں کے لئے رکھے گئے تھے۔

”یہ ٹوکن تو لے لیں۔“ کلرک نے پیچھے سے آواز دی۔

عمران پلٹ کر گیا اور ٹوکن لے آیا۔ بی تھری اتنی دیر میں صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ بینک میں زیادہ رش نہیں تھا۔ تین چار منٹ بعد کلرک نے پکارا۔ ”تین نمبر“ عمران اٹھا اور ونڈو کی طرف چلا۔ بی تھری بریف کیس لئے اس کے پیچھے تھا۔

”سر، آپ نے چیک کے پیچھے دستخط نہیں کئے ہیں۔“ کلرک نے چیک عمران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

عمران نے چیک لیا، اسے پلٹ کر اس پر دستخط کئے اور ذرا سا پہلو بدلا۔ ایک لمحے کو بی تھری کی طرف اس کی پشت ہو گئی۔ اس ایک لمحے میں عمران نے کام دکھا دیا۔ اب جو کچھ وہ کر سکتا تھا، کر چکا تھا۔ اب صرف دعا ہی کی جاسکتی تھی کہ بینک کا اسٹاف صورت حال کو سمجھ کر کچھ کرے۔

دونوں واپس چلے آئے۔

☆=====☆=====☆

دستخط ملانے والے کلرک نے چیک کے دستخط ملائے پھر چیک کے پیچھے والے دستخط دیکھ کئے۔ دستخط تو وہی تھے لیکن دستخط کے نیچے چھوٹے حروف میں لکھا SOS اس کی

عمران نے اس سے مصافحہ کیا۔ ”تشریف رکھیے۔ آپ کون.....؟“ اس نے بھی تھری کی طرف اشارہ کیا۔

عمران نے وہی کچھ دہرایا جو کیشیز سے کہا تھا پھر پوچھا۔ ”سمنٹ کا کیا ہوگا؟“
 ”اصلوً اتنی بڑی رقم نکلوانی ہو تو بینک کو ایک دن پہلے مطلع کرنا چاہئے۔“ منجر نے
 بے حد خوش اخلاقی سے کہا۔ ”لیکن ہم اپنے کلائنٹس کو مایوس نہیں کرتے البتہ یہ ضرور
 ہے کہ ادائیگی میں ذرا تاخیر ہوگی۔ آپ اتنی دیر میرے پاس تشریف رکھیں۔ کیش میں
 آپ کو بیس دوں گا تاکہ کوئی خطرہ نہ رہے۔ یہ بتائیے ٹھنڈا پیسے گے یا کافیا؟“
 عمران نے دانستہ بی تھری سے نظریں چرا لیں۔ ”کافی منگوا دیں۔“ اس نے بے
 تکلفی سے کہا۔

منیجر نے گھنٹی بجا کر چراسی کو بلایا اور اسے کافی لانے کو کہا پھر وہ عمران کی طرف متوجہ ہوا ”آپ اب بے فکر ہو جائیں۔“ اس نے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”آپ کا مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے اور آپ کا مسئلہ انشاء اللہ جلد ہی حل ہو جائے گا۔“
 عمران کو منیجر کے لہجے اور انداز کی معنی خیزی نے بہت سہارا دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کا پیغام سمجھ لیا گیا ہے اور منیجر نے اس سلسلے میں کچھ سوچ بھی لیا ہے۔ بی تھری بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا لیکن وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

چراہی کافی کی پالیاں رکھ گیا۔ فیبر سامنے رکھے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
 عمران چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ بی تھری بے دلی سے کافی پی رہا تھا۔ اب اسے
 گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اسے یہ الجھن بھی تھی کہ عمران اس سے نظریں چرا رہا ہے۔

وہ اس طرح بیٹھے تھے کہ دروازہ ان کی پشت پر تھا۔ بی تھری نے کرسی کو اتنا ترچھا کر لیا کہ اب کوئی اس کی نظروں میں آئے بغیر اندر نہیں آسکتا تھا۔ پانچ منٹ بعد دو خوش لباس ادھیڑ عمر آدمی کمرے میں آئے۔ صورت اور وضع قطع سے وہ کاروباری لگ رہے تھے۔ بی تھری انہیں دیکھ کر بھڑکا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ”آفاق صاحب، ہمارے اوڈی کا کیا بنا؟“ ان میں سے ایک نے کہا۔

نیجر نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ بی تھری کو ان دونوں کی طرف متوجہ پا کر اس نے آنکھ سے بی تھری کی طرف اشارہ کیا۔ ”جی ہاں آپ کا کام ہو گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آئیں تشریف رکھیں۔ میں ابھی اوڈی بنا دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ بی تھری سے مخاطب

تظروں سے چھپانہ رہ سکا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کلرک جانتا تھا کہ خطرے میں اس سگنل کے تحت مدد طلب کی جاتی ہے۔

عام طور پر کلرک دستخط ملا کر اوکے کر دیتے ہیں لیکن SOS نے کلرک کو چیک اچھی طرح دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ پہلی بار اس کی نظر رقم پر پڑی جو نکلوائی جا رہی تھی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دس لاکھ کی رقم اور SOS۔ اسے یقین ہو گیا کہ کوئی بڑی گز ہے۔

وہ اٹھا اور میجر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ میجر نے اس کی بات سننے اور چپکے جائزہ لینے کے بعد اسے تفصیلی ہدایت دیں۔ اسے رخصت کرنے کے بعد میجر فون پر ایک نمبر ملانے لگا۔ ”آپ دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں نا؟“ اس نے فون پر پوچھا۔ ”امکان ہے کہ وہ میرے کمرے میں ہوں گے۔ جی ٹھیک ہے۔“

☆=====☆=====☆

”ٹوکن نمبر تھری۔“ کلرک نے پکارا۔ عمران اور بی تھری اس بار کیش کاؤنٹر پر پہنچے۔
کیونکہ آواز وہیں سے دی گئی تھی۔ ”کس کا ہے ٹوکن تھری؟“
”میرا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”اور آپ؟“ کیشیز بی تھری کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”جی میں ان کے ساتھ ہوں۔“ بی تھری نے بلا تامل جواب دیا۔
 ”یہ میرے بھائی ہیں۔ اتنی بڑی رقم لینے میں اکیلا تو نہیں آسکتا تھا۔“ عمران۔
 ایک ایک لفظ پر ضرور دے کر کہا۔

”آپ کو فیجر صاحب کے کمرے میں جانا ہوگا۔“ کیشیر نے کہا۔ ”معاملہ بڑی رقم ہے۔ ہسٹنٹ وہیں سے ہوگی۔ وہاں بیٹھتے ہیں فیجر صاحب۔“ اس نے اشارہ کیا۔

عمران فیجر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ لی تھری چند لمحوں پہنچایا لیکن فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس نے عمران کو اکیلا چھوڑا تو ٹھیل بگڑ سکتا ہے۔ دو لمبے ڈگ بھر کے عمران تک پہنچ گیا۔ ”کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”یاد رکھنا، تمہاری بہن کی زندگی تمہارے رحم و کرم پر ہے۔“

”تم فکر نہ کرو۔“ عمران نے بھی سرگوشی کی۔
بینک منیجر انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”عمران صاحب؟“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

لے گئی۔ دوسری طرف سے اب بھی..... انگیج کی ٹون سنائی دے رہی تھی۔

اس بار اس نے بینک کی طرف دیکھا تو اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے دونوں سادہ لباس والوں کو باہر آتے دیکھا۔ ان کے درمیان بی تھری تھا اور اسے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ ایک سادہ لباس والے نے رک کر دروازے کے ارد گرد کھڑے پولیس والوں سے کچھ بات کی۔ پولیس والے وہیں رہ گئے اور سادہ لباس والے بی تھری کو پولیس گاڑی کی طرف لے گئے۔ اتنی دیر میں بینک سے عمران بھی نکل آیا۔ وہ بھی پولیس گاڑی میں جا بیٹھا پولیس روانہ ہو گئی۔

بی ٹو کا جی چاہا کہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہو مگر اس نے خود کو سمجھایا۔ پہلی بات تو یہ کہ اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ پولیس کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ بلکہ اس کی یہاں موجودگی کا علم تو بی تھری کو بھی نہیں تھا۔ دوسری بات یہ کہ اسے چیف کو اس بات کی اطلاع دینا تھی کہ کھیل خراب ہو چکا ہے تاکہ وہ اس فلیٹ سے نکل بھاگیں۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بج کر ستائیس منٹ ہوئے تھے۔ دل اب بھی اسے بھاگ لینے کی نصیحت کر رہا تھا۔ ادھر اس کے ہاتھ بھی لرز رہے تھے۔ اسے احساس تھا کہ خطرے سے براہ راست دوچار نہ ہونے کے باوجود اس کے اعصاب زیادہ دیر ساتھ نہیں دیں گے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ساڑھے گیارہ بجے تک وہ بہر حال چیف کو فون کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ ہاں اس کے بعد وہ یہاں نہیں رکے گا۔

اس سے پہلے وہ اس امکان پر غور کر چکا تھا کہ وہ گلستان جو ہر جا کر خود چیف کو صورت حال سے مطلع کرے گا لیکن اسے ہمت نہیں پڑی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں کی پولیس وائریس پر گلستان جو ہر کی پولیس کو اطلاع دے گی تو وہاں کی پولیس کو اس فلیٹ پر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ بلکہ ممکن تھا کہ اب تک پولیس اس فلیٹ کو گھیرے میں لے چکی ہو۔

اس خیال سے اس پر کپکپی چڑھنے لگی پھر بھی دل کڑا کر کے اس نے پھر فون نرائی کیا لیکن فلیٹ کا فون اب بھی انگیج تھا۔ وہ چوتھی بار نرائی کر رہا تھا کہ بینک کے دروازے پر کھڑے پولیس والے کو اس نے سڑک پار کر کے اس طرف آتے دیکھا۔ اب پانی سر سے گزر رہا تھا۔ اس نے گھبراہٹ میں کارڈ انٹرومنٹ میں لگا چھوڑا اور تیز قدموں سے اس طرف چل دیا جہاں اس نے موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔ اس نے بڑی کوشش کر کے

ہوا ”یہ کافی ٹھنڈی ہو گئی ہوگی آپ کی۔“

بی تھری بلا ارادہ کافی کی پیالی پر جھکا۔ اسی لمحے اسے جکڑ لیا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ دونوں آنے والوں کی گرفت میں تھے۔ ”زور نہ لگانا بر خوردار۔“ اوڈی کا سوال کرنے والے نے تنبیہ کی۔ ”ورنہ عمر بھر کے لئے اپاچ ہو جاؤ گے۔“

☆=====☆

بی ٹو کو بینک کے سامنے والے فٹ پاتھ پر کھڑے آدھا گھٹنا ہو چکا تھا۔ اب اس پر گھبراہٹ سوار ہو رہی تھی۔ چیک کیش ہونے میں اتنی دیر! پھر اسے خیال آیا کہ وہ کوئی عام چیک نہیں، دس لاکھ کا چیک ہے۔ وہ پھر جم کر کھڑا ہو گیا لیکن اس کا دل اب بھی گھبرا رہا تھا۔

اچانک اسے پولیس کی ایک گاڑی دور سے آتی نظر آئی۔ اس کا رخ بینک کی طرف ہی تھا۔ اسے دیکھ کر بی ٹو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ بینک کو بھول کر اب وہ پولیس کی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔

پولیس کی گاڑی کچھ پیچھے ہی رک گئی۔ اس میں سے آٹھ باوردی پولیس والے اترے۔ ان کے علاوہ دو افراد بھی تھے جو سوٹ پہنے ہوئے تھے انہوں نے ٹائیاں بھی لگائی ہوئی تھیں۔ دیکھنے میں متمول طبقے کے کاروباری لگ رہے تھے۔ وہ بینک کی طرف چل دیے۔ باوردی پولیس والے ان سے کچھ فاصلہ رکھ کر چل رہے تھے۔

بی ٹو دھڑکتے دل کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی نظریں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ اس نے دونوں سادہ لباس والوں کو بینک میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ باوردی پولیس مین بینک میں داخل نہیں ہوئے۔ انہوں نے بینک کے دروازے کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی۔

بی ٹو تیزی سے حرکت میں آیا۔ کارنر پر ٹیلپ کا ٹیلی فون نصب تھا۔ اس کی جیب میں کارڈ موجود تھا۔ اس نے کارڈ لگایا اور نمبر ملایا لیکن دوسری طرف سے انگیج کی ٹون آرہی تھی۔ اس نے بینک کی طرف دیکھا۔ پولیس والے بدستور پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے لیکن کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آرہی تھی۔

اس نے تین چار بار نمبر اور نرائی کیا۔ مسلسل انگیج کی ٹون سن کر وہ جھنجھلا گیا۔ اس نے کارڈ کھینچا اور دوبارہ اپنی جگہ واپس چلا آیا مگر بے چینی اسے پھر ٹیلپ فون کی طرف

خود کو بھاگنے سے باز رکھا تھا۔

موٹر سائیکل اشارت کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اب کہاں جائے گا۔ اب تو گھر بھی مخدوش ہو چکا ہے۔

☆=====☆=====☆

عمران سی آئی اے سینٹر میں انسپٹر فاروق کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ یہیں سے اس نے اپنے اور ثمنہ کے گھر فون کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ابو اور انیس صاحب یہاں پہنچ چکے تھے۔ دونوں عمران سے تفصیل سن چکے تھے اور بے حد متوحش نظر آرہے تھے۔ ”بیٹے، تم نے غلطی کی۔ ثمنہ کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈال دیا۔“ ابو اور انیس صاحب دونوں نے ایک ہی بات کہی تھی۔ اب وہ انہیں کیسے سمجھاتا کہ ثمنہ کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے اور اس نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ انیس صاحب نے اس کی خاموشی کو شرم ساری پر محمول کرتے ہوئے دلاسا دیا۔ ”نہیں بیٹے میں زیادتی کر رہا ہوں۔ تم نے غلطی نہیں کی۔ ایسی صورت حال میں ہوش و حواس بھلا کہاں ساتھ رہتے ہیں۔“

اب وہ تینوں کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے انسپٹر فاروق کمرے میں آیا۔ ”بات آگے بڑھی ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔ ”ہم نے فلیٹ کا محاصرہ کر لیا ہے۔ ابھی مجرموں کو پتا نہیں ہے۔ ممکن ہے، ان میں سے کوئی پریشان ہو کر باہر نکلے۔ اس صورت میں ہم اسے چھاپ لیں گے۔ ایک پر قابو پانا اتنا دشوار نہیں ہو گا۔ ادھر اس لڑکے نے زبان کھول دی ہے۔ ہمیں مجرموں کے متعلق پوری تفصیل معلوم ہو گئی ہے۔“

”انسپکٹر، تمہارے محاصرے سے ہماری بہو کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہے۔“ ایاز صاحب نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔ انیس صاحب نے ان کی تائید کی۔

”خطرے میں تو وہ ویسے بھی ہیں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”پھر بھی ہم ہر ممکن احتیاط کریں گے۔ ہمیں اوپر سے بھی ہدایات مل چکی ہیں۔ آپ اثر و رسوخ والے لوگ ہیں۔“ اس کے لہجے میں چڑنے کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ ”فلیٹ کے محاصرے کا سپرویزن ہمارے ڈی ایس پی صاحب کر رہے ہیں۔“

”ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔“ ایاز صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ انیس صاحب بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ٹھیک ہے آپ چلے جائیں۔“ انسپکٹر بولا۔ ”عمران صاحب کو یہیں رکنا ہو گا۔ ہمیں ان کی مدد کی ضرورت ہے۔“

☆=====☆=====☆

دوپہر کا ایک بج گیا تھا۔ چیف کو اب تشویش ہونے لگی تھی۔ اس نے ثمنہ کو فون کرنے پر مجبور کر دیا۔ گفتگو کے دوران وہ ثمنہ کے سر پر کھڑا رہا۔

دوسری طرف مینجر نے ہی فون اٹھایا۔ ”سنئے..... میرے شوہر عمران ایاز کا آپ کے بینک میں اکاؤنٹ ہے۔ وہ دس لاکھ کا چیک کیش کرانے آئے تھے۔ ابھی تک گھر واپس نہیں پہنچے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔“

”آپ کون ہیں؟“ مینجر نے پوچھا۔ اسے بھی تفصیلی ہدایات دی گئی تھیں کہ اس قسم کی صورت حال میں اسے کیسی گفتگو کرنی ہے۔

”جی میں مسز عمران ہوں۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسز عمران.....“

اس مرحلے پر چیف نے ثمنہ سے فون لیا اور خود مینجر کی وضاحت سنی۔

”ہم آج ہی ادائیگی کر رہے ہیں۔“ مینجر کہہ رہا تھا۔ ”لیکن اس میں ذرا دیر لگے گی۔ بڑی رقم ہے نا۔ ہم اپنی شاخ میں عام طور پر اتنی بڑی رقم نہیں رکھتے۔ یہاں صرف چھوٹے چیک کیش ہوتے ہیں۔ کسی کو بڑی رقم نکلوانی ہو تو وہ ایک دن پہلے ہمیں مطلع کرتا ہے۔ اگلے روز ہم زیادہ کیش منگوا لیتے ہیں۔ اب بھی ہم نے ہیڈ آفس سے رقم منگوائی ہے، مجھے امید ہے کہ سوا دو بجے تک آپ کے شوہر یہاں سے فارغ ہو جائیں گے۔“

چیف نے سر کو تفسیمی جنبش دیتے ہوئے ریسپور ثمنہ کو دے دیا۔ ”شکریہ مینجر خدا حافظ۔“ اس نے ریسپور رکھ دیا۔

چیف کو مطمئن ہونا چاہئے تھا لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں اسے خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ بہت دیر سے اس نے سگریٹ نہیں پی ہے۔ اسی لئے وہ اعصاب زدہ ہو رہا ہے۔ دراصل وہ یہاں اتنے لمبے قیام کی نیت سے نہیں آئے تھے اور اس کی سگریٹیں رات ہی کو ختم ہو گئی تھیں۔

اس خیال سے اسے اطمینان ہوا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ تین بجے سے پہلے فلیٹ

عمران نے خبر پڑھنے کے بعد اخبار ایک طرف رکھا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کا دماغ سنسنار رہا تھا۔ کیا یہ وہ ٹیمینہ تھی جس کی گفتگو اس نے روز اتفاقہ طور پر فون پر سن لی تھی؟ اگر ایسا ہے تو اس کی ٹیمینہ..... اومانی گاڑ، ٹیمینہ خطرے میں ہے، میں نے اسے مروانے کا سامان کر دیا ہے۔

لیکن اس کے ذہن میں اب بھی ایک گرہ تھی۔ ڈاکوؤں کو اس کا اور ٹیمینہ کا نام کیسے معلوم ہوا؟

اس غلطی کے باوجود اب وہ پریشان تھا۔ ٹیمینہ تین سفاک ڈاکوؤں کے ساتھ گھر میں اکیلی ہے جلد یا بدیر ڈاکوؤں کو علم ہو جائے گا کہ پولیس نے انہیں گھیر لیا ہے۔ صرف اس لئے کہ عمران نے ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس کے بعد وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ وہ انتقام ٹیمینہ کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔

اس پر وحشت طاری ہونے لگی۔ وہ اٹھ کر چھوٹے سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اب ٹیمینہ کو بچانا ضروری تھا اور یہ کام اسی کو کرنا تھا لیکن کیسے؟ وہ دیوانہ وار فلیٹ میں جا گھستا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ اس کے بس سے باہر ہے اور اس سے مسئلہ بھی حل نہیں ہو گا۔ وہ عملی آدمی نہیں تھا۔ اس کا سب سے اہم ہتھیار اس کا تخیل تھا لیکن اس سنگین اور عملی نوعیت کے معاملے میں تخیل سے کیا کام لیا جاسکتا تھا۔ وہ ٹھٹھا اور سوچتا رہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے نکلے اور سیدھا فلیٹ کا رخ کرے۔

اچانک اسے ایک خیال سوجھ گیا۔ ابتدا میں تو یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ قابل عمل ہے یا نہیں لیکن جیسے جیسے وہ سوچتا گیا اس کے جسم میں سنسنی دوڑتی گئی۔ یہ خیال بے حد خوش آئندہ تھا کہ وہ ٹیمینہ کو بچا سکتا ہے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ اگر ٹیمینہ کو کچھ ہو گیا تو وہ تمام عمر احساس جرم کے بوجھ تلے سسکتا رہے گا۔ کبھی خوش نہیں رہ سکے گا۔ اس نے ذہن میں تمام جزئیات ترتیب دے لیں۔

سوال یہ تھا کہ معلومات کیسے حاصل کی جائیں۔ انسپکٹر فاروق سے کچھ اگلوانا بہت مشکل ہے۔

اسی لمحے انسپکٹر فاروق نے اسے چونکا دیا۔ ”ایک اور اہم بات معلوم ہوئی ہے۔“

عمران نے سر اٹھا کر انسپکٹر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ کی ملازمہ زیب النساء ڈاکوؤں کی مخبر ہے۔“

سے نہیں نکل سکیں گے۔ بہتر یہی تھا کہ سگریٹ منگوا لی جائے۔ اس نے بی دن سے کہا۔ ”یار تم ذرا جا کر مجھے سگریٹ لا دو۔ خطرہ تو کوئی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ذرا محتاط رہنا۔“

بی دن کو یہ حکم تکلیف دہ لگا۔ سگریٹ کی دکان کافی دور تھی مگر اتنی کامیاب واردات کے بعد وہ چیف کو ناخوش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے چہرے سے رومال ہٹایا اور دروازہ کھول کر فلیٹ سے نکل آیا۔ چشمہ وہ اب بھی لگائے ہوئے تھا۔ باہر نکلتے ہوئے اسے گمان بھی نہیں تھا کہ سامنے والے فلیٹ کے دروازے کی چیمپنگ آئی سے اسے کوئی دیکھ رہا تھا۔ وہ تو یہ جانتا تھا کہ یہ فلیٹ ابھی آباد ہی نہیں ہوا ہے۔

سامنے والے فلیٹ میں موجود پولیس مین نے وارنریس پر رابطہ کیا.....

☆=====☆=====☆

انسپکٹر فاروق نے عمران کی طرف اخبار بڑھایا۔ ”میں ذرا معلوم کر آؤں کہ ملزم سے کچھ اور معلومات حاصل ہو سکیں یا نہیں۔“

عمران کا اخبار پڑھنے کا موڈ نہیں تھا۔ وہ یوں بیٹھے بیٹھے عاجز آچکا تھا۔ اس نے یونہی اخبار دیکھنا شروع کیا۔ قدرتی طور پر ڈاکے کی خبروں میں وہ دلچسپی لے رہا تھا۔ اچانک ایک خبر نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ سرنی تھی۔

شادی کے صرف چار ماہ بعد ٹیمینہ سفاک ڈاکوؤں کے ہاتھوں بیوہ ہو گئی۔

عمران بے تابی سے خبر پڑھنے لگا۔ خبر کے مطابق یہ واردات گلشن اقبال میں ہوئی تھی۔ ڈاکوؤں نے مزاحمت کرنے پر صاحب خانہ مسعود حسن کو شوٹ کر دیا تھا اور گھر کے تمام زیورات اور نقدی لوٹ کر لے گئے تھے۔ مقتول کی صرف چار ماہ پہلے شادی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ رین بو اپارٹمنٹس کے اس فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ صرف چار ماہ کے بعد بیوہ ہو جانے والی ٹیمینہ نے پولیس کو بتایا کہ ڈاکوؤں کی تعداد چار تھی اور انہوں نے چہروں پر ڈھانٹے باندھ رکھے تھے لہذا کسی کو پہچاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ٹیمینہ نے یہ بھی بتایا کہ اس کے شوہر مسعود نے ایک ڈاکو سے ہاتھ پائی کی تھی جس کے نتیجے میں ڈاکو نے اسے شوٹ کر دیا۔ یاد رہے کہ ٹیمینہ یونیک نیکسٹل ملز کے مالک اقبال کی بیٹی ہے۔

عمران کے لیے وہ بہت بڑا دھماکا تھا لیکن اس کی سب سے بڑی غلش بھی دور ہو گئی۔ ڈاکوؤں کو اس کے اور ٹینے کے نام زیو نے بتائے تھے۔

اس کا ذہن اب بھی یہی تکرار کر رہا تھا۔ انسپٹر فاروق سے معلومات کیسے اگلوائی جائیں پھر اس نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ”انسپٹر مجھے ڈاکوؤں کے متعلق معلومات فراہم کر سکتے ہو۔ ان کے نام کیا ہیں۔ وہ کہاں رہتے ہیں خاص طور پر ان کا چیف۔“ انسپٹر فاروق نے اسے غور سے دیکھا۔ ”سوری یہ ممکن نہیں۔“

”لیکن اس میں کیا حرج ہے؟“

”ہم ایسا کر کے مزید قانون شکنی اور نقص امن کا امکان کیوں پیدا کریں۔“

عمران کو انسپٹر کی بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ ”کیا میں تمہیں ایسا نظر آتا ہوں؟“ اس نے ترش لہجے میں کہا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عزیز ترین ہستی کو خطرہ لاحق ہو تو بے ضرر لوگ بھی مرنے مارنے پر قتل جاتے ہیں۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا۔“

”سوری عمران صاحب۔“

”تم اس بات کی اہمیت نہیں سمجھ رہے ہو۔“ عمران نے چیخ کر کہا۔ ”میری بیوی کو پولیس نہیں بچا سکتی۔ ہاں میں بچا سکتا ہوں۔“

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔“ انسپٹر نے رسان سے کہا۔ ”لیکن میں مجرموں کی فیملی کو مجرم سمجھنے کا قائل نہیں میں انہیں خطرے سے دوچار کبھی نہیں کروں گا۔“

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔.....“

انسپٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”سوری عمران صاحب۔“

عمران پاؤں پٹختا، مٹھیاں جھینچے انسپٹر کی طرف دیکھا۔

”اب اس وقت آپ آئینہ دیکھ لیں تو میری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔“ انسپٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ آپ کے سامنے مجرم کے گھر کا کوئی فرد نہیں، قانون کا ایک محافظ کھڑا ہے۔ مگر آپ مرنے مارنے پر آمادہ ہیں۔“

وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بعد ہی بات کی جاسکتی تھی۔

☆=====☆=====☆

بی دن کو گئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا اور وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اب چیف کا تشویش سے برا حال تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ پورے معاملے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اب تو اسے اس پر بھی شک تھا کہ بینک مینجر نے فون پر جو کچھ بتایا تھا درست تھا مگر سوال یہ تھا کہ بی ٹی کیا کر رہا ہے؟ اس نے کسی گڑبڑ کی صورت میں فون کیوں نہیں کیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ بھی گرفتار ہو گیا ہو۔

اس نے ٹینے کی طرف دیکھا جو سامنے صوفے پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ اگر پورا منصوبہ پٹ گیا تھا تو وہی اس کے آخری ٹرمپ کارڈ کی حیثیت رکھتی تھی لیکن مجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا ہو گا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ہلکی سی لرزش دیکھ کر سوچا۔

مگر یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ ہاتھوں کی لرزش کم نہیں ہو رہی تھی، بڑھ رہی تھی۔ اس نے زیو کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور سرگوشی میں باتیں کرنے لگا۔

☆=====☆=====☆

زیب النساء فلیٹ سے نکلی تو بہت خوف زدہ تھی۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اس طرح استعمال کیا جائے گا۔ چیف نے اسے باہر جانے کو کہا تو اس نے احتجاج کیا کہ بی دن کی طرح وہ بھی واپس نہیں آسکے گی۔ اس پر چیف نے مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس صورت میں وہ پولیس تک اس کا ایک پیغام پہنچا سکتی ہے۔

”لیکن میں باہر نہیں جانا چاہتی۔“

”باہر زندگی ہے، جیل کی ہی سہی لیکن یہاں تو تمہارے لئے صرف موت ہے۔ میرے ہاتھوں۔“ چیف نے بے حد سفاک لہجے میں کہا تھا۔

یوں چارو ناچار زیو کو باہر نکلنا پڑا لیکن خوف سے اس کا برا حال تھا۔ وہ لرزے قدموں سے پارک کی طرف چلتی رہی۔

پارک کے قریب اچانک ہی اسے پولیس والوں نے گھیر لیا لیکن وہ اس کے لئے تیار تھی۔

اسے ڈی ایس پی کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں ایاز صاحب بھی تھے۔ اس کے ساتھ ایک اور مسمر آدنی بھی تھا، جسے وہ نہیں پہچانتی تھی۔ ایاز صاحب کو دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

”کب سے ڈاکوؤں کے لئے مخبری کر رہی ہو تم؟“ ڈی ایس پی نے سخت لہجے میں اس سے پوچھا۔

”اس سے کام کی بات پوچھیں بھئی صاحب۔“ انیس صاحب نے ڈی ایس پی کو ٹوکا۔

”میں آپ کو ایک ہی بات بتا سکتی ہوں۔“ زیبو نے کہا۔ ”اس نے کھلوا یا ہے کہ اسے کچھ ہونے سے پہلے باجی ہلاک ہو جائیں گی۔ اس نے مجھے بھی بدوق کے زور پر باہر نکالا ہے۔ یہی پیغام بھجوانے کے لئے۔“

یہ سن کر انیس الرحمان اور ایاز صاحب کے چروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ”آپ کا کیا ارادہ ہے؟“ انیس صاحب نے ڈی ایس پی سے پوچھا۔

”آپ بے فکر رہیں ہم اس پر قابو پالیں گے۔“ ڈی ایس پی بھٹی نے کہا۔ ”لیکن میری بیٹی کی جان خطرے میں ہے۔“ انیس صاحب بولے۔ ”میں اس کا ہر مطالبہ پورا کرنے کو تیار ہوں۔“

”ہم مجرموں سے سمجھوتے نہیں کرتے جناب۔“ ڈی ایس پی نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”ہم کمانڈو کارروائی کریں گے۔“

”میں آئی جی سے بات کروں گا۔“ ”یہ سب کچھ انہی کے حکم کے مطابق ہو رہا ہے۔“ ”تو پھر ہمیں فلیٹ میں جانے دیں۔“ ایاز صاحب بولے۔ ”ہم اسے سمجھانے کی کوشش کریں گے۔“

”وہ آپ کی زبان نہیں سمجھے گا۔ یہ لوگ گولی کی زبان سمجھتے ہیں۔“ ”پھر بھی ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے کمانڈو ایکشن کے وقت ہم اپنی بیٹی کے ساتھ ہوں۔“

”میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ ”میں اس سلسلے میں آئی جی صاحب سے بات ضرور کروں گا۔ میری بات کرائیے ان سے۔“ انیس صاحب نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

☆=====☆

”یہ کل جو گلشن اقبال میں ڈکیتی ہوئی ہے یہ کیس کس کے پاس ہے؟“ عمران نے

انسپکٹر فاروق سے پوچھا۔

”میرے ہی پاس ہے کوئی سراغ نہیں ملا ہے اب تک۔“

”میں مجرم تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔“ عمران نے اعتماد سے کہا۔

انسپکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟ تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو۔“

”میں تمہیں اصل مجرم تک پہنچا سکتا ہوں۔“

”تو پھر بتاؤ۔ تمہیں ویسے بھی قانون کی مدد کرنی چاہیے۔“

”میں اس کے لئے تیار ہوں لیکن قانون کو بھی میری مدد کرنی ہوگی۔“

انسپکٹر کی آنکھوں میں الجھن جھانکنے لگی۔ ”تم اپنے مجرموں کے نام اور پتے چاہتے ہو نا؟“

”صرف ان کے سرغنہ کا۔ باقی سب بے کار ہیں اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ خلاف قانون کوئی کام نہیں کروں گا۔“

انسپکٹر تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم بلف کر رہے ہو میرے ساتھ۔ تمہارا اس واردات سے کیا تعلق؟“

”میرا کوئی تعلق نہیں لیکن میں اصل مجرم تمہیں دے سکتا ہوں۔“

”اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے دھوکا نہیں دے رہے ہو۔“

”اس کی کوئی ضمانت نہیں لیکن میں جھوٹ کبھی نہیں بولتا۔“

”توچ میں تم سے ویسے بھی اگلا سکتا ہوں۔“

عمران کا چہرہ تھما اٹھا۔ ”کوشش کر دیکھو۔ میں کوئی بے بس شری نہیں کہ تم جو چاہو کر گزرو۔ بغیر کسی وجہ کے پکڑ لو اور تشدد کرو۔“

انسپکٹر کھسیا گیا۔ ”سوری عمران صاحب۔ میں اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ بس منہ سے یہ بات نکل گئی۔ ٹھیک ہے آپ اپنی معلومات مجھے فراہم کریں۔ میں آپ کو آپ کی مطلوبہ معلومات فراہم کروں گا لیکن یہ وعدہ نہ بھولیے گا کہ آپ کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کریں گے۔“

چند لمحے دونوں میں اس پر بحث ہوتی رہی کہ پہلے زبان کون کھولے گا۔ اس بار

انسپکٹر ڈٹ گیا۔ غرض کیونکہ عمران کی بڑی تھی اس لئے اسے ہی ہتھیار ڈالنا پڑے۔
”تو سنو“ اس نے کہا۔ ”ثینہ کا ایک کزن ہے جس نے اس کا رشتہ بھی مانگا تھا لیکن اقبال صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ وہ یوکیب چلاتا ہے۔ یہ واردات اسی نے کی ہے۔ مقصد صرف ثینہ کے شوہر کو راستے سے ہٹانا تھا جو مال ملا وہ بونس ہے اسے پکڑو اور سب کچھ اگلو۔“

انسپکٹر فاروق کے چہرے سے دبا دبا ہجماں ظاہر ہو رہا تھا۔ ”اس کا نام؟“

”نام مجھے نہیں معلوم۔ ثینہ یا اقبال صاحب بتا سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے عمران صاحب۔ اب آپ اپنی واردات کے سرغنہ کا نام اور پتا نوٹ کر

لیں۔“

☆=====☆=====☆

ثینہ کو احساس ہو گیا تھا کہ صورت حال بہت سنگین ہو چکی ہے۔ اب وہ گھر میں چیف کے ساتھ اکیلی تھی اور چیف بہت اعصاب زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ثینہ کا اندازہ تھا کہ عمران کسی طرح نہ طرح ڈاکوؤں کے چنگل سے نکل گیا ہے بلکہ اس نے انہیں گرفتار بھی کرا دیا ہے۔ اب صرف چیف ہی آزاد ہے۔ یہ خیال اس کے لئے طمانیت بخش تھا کہ عمران اب خطرے میں نہیں لیکن اسے خوف تھا کہ اب شاید وہ نہیں بچ سکے گی۔ اس نے چیف کے ہاتھوں میں لرزش دیکھ لی تھی اور جانتی تھی کہ جن ہاتھوں میں خطرناک گن ہو، ان ہاتھوں کی لرزش ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے۔

”ثینہ لی بی، ہمارا تو اب مرنے جینے کا ساتھ ہے۔“ چیف نے اسے چونکا دیا۔ ”یاد رکھنا، جو میرا حشر ہو گا وہی تمہارا ہو گا۔“

یعنی بات کھل کر سامنے آگئی۔ چیف کی دھمکی بے حد واضح تھی۔

چیف نے دھمکی تو دے دی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ زیب النساء کے ذریعے وہ دھمکی بھجوا چکا تھا مگر پولیس کا کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ اگر وہ فون پر اس سے بات کر لیتے تو وہ نسبتاً پرسکون ہو جاتا۔ اسے پولیس کی بے پروائی اور بے نیازی سے خوف آ رہا تھا۔ ایسا کسی مضبوطی ہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ اب تو زیب النساء کو گئے ہوئے بھی تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ وہ گیلری میں جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا کہ گرد و پیش کا جائزہ لے سکے۔ وہ تو

گھڑی کے پاس بھی نہیں جا رہا تھا۔
اطلاعی گھنٹی بجی تو وہ اچھل پڑا۔

”اٹھ جاؤ لی بی۔ میرے ساتھ دروازے تک چلو۔“ چیف نے گن لہراتے ہوئے کہا۔

ثینہ انھی اور اس کے ساتھ چل دی۔ چیف نے پیسنگ آئی سے آنکھ لگائی اور باہر دیکھا۔ وہاں دو مرد کھڑے تھے۔ دونوں کی عمریں پچاس سے اوپر تھیں۔ ان میں سے ایک نے پھر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔

”ذرا جھانک کر دیکھو۔ یہ لوگ کون ہیں۔“ چیف نے سرگوشی میں کہا۔

ثینہ نے پیسنگ آئی سے دیکھا۔ ”میرے ابا جان اور سرس ہیں۔“ اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے اب تم ہٹ جاؤ۔“ چیف نے کہا پھر بلند آواز میں بولا۔ ”تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟“

”تم تمہارا ہر مطالبہ ماننے کو تیار ہیں۔“ باہر سے ایاز صاحب نے کہا۔ ”بس ثینہ بیٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

”تمہارے ماننے سے کچھ نہیں ہو گا۔ اصل مسئلہ تو پولیس کا ہے۔“ چیف نے چیخ کر کہا۔

”اچھا، تم ہمیں یہ غمال بنا لو۔ ثینہ کو چھوڑ دو۔“

چیف نے اس پر چند لمحے غور کیا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ ان دونوں کو بھی بلا کر یہ غمال بنالے لیکن تین پر نظر رکھنا آسان نہیں تھا۔ تبادلے والی بات میں بھی وہ خسارے ہی میں رہتا۔ لڑکی بہتر یہ غمال تھی۔ اس سے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ ”نہیں شکریہ۔“ وہ چلایا۔ ”میری بچت کے لئے یہ خاتون ہی کافی ہیں۔“

”خدا کے لئے.....“

اسی لمحے چیف کو احساس ہوا کہ اب وہ اس فلیٹ میں قید نہیں رہ سکتا۔ حقیقت پسندی سے سوچا جائے تو یہ طے ہے کہ اب اس کے بچنے کا امکان نہیں لیکن گرفتار ہونا اسے گوارا نہیں تھا۔ تو اسے ثینہ کو کلاشکوف کی زد پر لے کر باہر نکلتا تھا۔ اندر تو ہر حال میں اسے مارا جاتا تھا۔ باہر نکلنے میں ایک امکان تھا کہ شاید کچھ ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ

پولیس ٹیمہ کی موجودگی کی زیادہ پروا نہیں کرے گی۔ البتہ یہ دونوں پولیس پر دباؤ ڈال سکیں تو شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔

”آپ دونوں میری بات غور سے سنیں۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”میں کسی حال میں گرفتاری نہیں دوں گا اور پولیس مجھ پر فائر کرے گی تو میں یقینی طور پر اس خاتون کو ختم کر دوں گا۔ اگر آپ پولیس کو روک سکیں تو روک لیں۔ ورنہ میں اکیلا نہیں مروں گا۔“

”بات تو سنو.....“

”میں کچھ نہیں سنوں گا۔ آپ سنیں۔ میں آپ لوگوں کو صرف پندرہ منٹ کی مہلت دے رہا ہوں۔ پندرہ منٹ کے اندر ایک گاڑی یہاں لا کر کھڑی کر دیں۔ ٹکلی فنل ہونی چاہئے اگر ایسا نہیں ہوا تو میں اس خاتون کو شوٹ کر دوں گا اور اس کے بعد آخری گولی تک مقابلہ کروں گا بس اب آپ چل دیں، اس لمحے سے آپ کے پاس صرف پندرہ منٹ کی مہلت ہے۔“

☆=====☆=====☆

ایاز اور انیس الرحمن ڈی ایس پی کے پاس پہنچے تو ہانپ رہے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ انہوں نے چیف کا پیغام ڈی ایس پی کو پہنچا دیا۔ ڈی ایس پی نے آئی جی کو مطلع کیا۔ آئی جی سے انیس صاحب کے مراسم بھی تھے انہوں نے آئی جی سے بات کی۔ طے یہ پایا کہ مجرم کا مطالبہ ماننا پڑے گا۔

وہ لوگ تیزی سے حرکت میں آئے، وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

فیصلے کا لمحہ آپہنچا تھا۔ اب خوف کی گنجائش نہیں تھی۔ چیف نے دل کڑا کر لیا تھا۔ اس نے کھڑی میں وقت دیکھا۔ اس کی دی ہوئی مہلت میں دس منٹ گزر چکے تھے مگر اب اس کا گیلری میں جانا لازمی تھا ورنہ اسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اس نے گن ٹیمہ کی کمر سے لگائی اور اسے آگے آگے لئے بالکونی میں آگیا۔ باہر کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ وہ کھڑا رہا۔ اس کی انگلی ٹریگر کو دبانے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔

دو منٹ بعد بلڈنگ کے سامنے ایک کار رکی۔ وہ پرانے ماڈل کی نوپوٹا تھی۔ اس میں سے پولیس والے اترے۔ ان کی تعداد چار تھی۔

”تم سب اتنی دور چلے جاؤ کہ مجھے نظر نہ آؤ۔ ورنہ یاد رکھو، میں لڑکی کو شوٹ کر دوں گا۔“ چیف نے چیخ کر کہا۔

پولیس والوں نے اوپر بالکونی کی طرف دیکھا، اور پھر اس طرف چل دیئے جہاں سے گاڑی آئی تھی۔

چیف کو احساس تھا کہ اکیلے ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن بہت خراب ہے کاش کوئی ایک ساتھی ہمراہ ہوتا۔ بہر حال اب تو اسے اس مرحلے سے اکیلے ہی گزرنا تھا۔

☆=====☆=====☆

عمران نے کل ہیل کا بٹن دبایا۔ قدموں کی آہٹ سنائی دی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔ ”کون ہیں آپ؟ کیا بات ہے؟“

”جی مجھے بابا نے بھیجا ہے۔“ عمران نے کہا۔

دروازہ کھول دیا گیا۔ سامنے سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی تھی۔ ”بھائی خیریت سے تو ہیں۔ رات گھر بھی نہیں آئے۔“ لڑکی کے لمبے میں پریشانی تھی۔

عمران لڑکی کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر گھس گیا۔ ”خاموشی سے دروازہ بند کر دو۔“ اس نے جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے سخت لمبے میں کہا۔

لڑکی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ تو جیسے بت بن گئی تھی۔ دروازہ عمران کو خود ہی بند کرنا پڑا۔ ”گھر میں کون کون ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”امی ہیں، بابی ہیں اور میں ہوں۔“

”کہاں ہیں۔ مجھے ان کے پاس لے چلو۔“

”نہیں..... نہیں.....“ لڑکی نے ہڈیانی لمبے میں کہا۔

”چلو۔“ عمران نے ریوالور لہرایا۔ یہ سب کچھ اسے بہت شاق گزر رہا تھا لیکن اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

لڑکی اسے اپنے بیڈروم میں لے گئی۔ وہاں ایک معمر خاتون تھیں اور ایک چوبیس پچیس سال کی لڑکی۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ خاتون نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کی خوف زدہ نظریں عمران کے ریوالور پر جمی تھیں۔

نیمبل پر ٹیلی فون دیکھ کر عمران کی جان میں جان آئی۔ اس نے کہا۔ ”آپ تینوں سامنے کونے میں کھڑی ہو جائیں۔ پلیز چیخیں گا نہیں۔ میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

دروازہ کھولنے والی لڑکی ماں سے لپٹ گئی۔ ماں نے دوسری لڑکی کو بھی لپٹا لیا۔ تینوں کونے میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ عمران کو اطمینان تھا کہ وہ کوئی گزبڑ نہیں کریں گی۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی تھیں۔

وہ ٹیلی فون کے پاس جا بیٹھا۔ اس کا ریوالتور کا رخ تینوں کی طرف تھا۔

☆=====☆=====☆

چیف مطمئن ہو کر ٹینے کو لیے ہوئے اندر آیا۔ اس کی گن بدستور ٹینے کی کمرے گئی ہوئی تھی۔ وہ اسے دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف لے چلا۔ کھیل فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے چٹنی گرائی اور تاب پر ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ تاب پر جم کر رہ گیا۔

اسٹڈی میں ٹیلی فون کی ٹھنٹی چینی تھی۔

چیف کا ہاتھ تاب پر متحرک ہو گیا۔ وہ فون کو نظر انداز کر دینا چاہتا تھا مگر پھر اسے خیال آیا کہ فون پولیس کا بھی ہو سکتا ہے۔ اسٹڈی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

”اسٹڈی میں چلو۔“ اس نے ٹینے سے کہا۔

ٹینے کو سامنے کھڑا کر کے اس نے ریسیور اٹھایا۔ ”سلیم بابا۔“ دوسری طرف سے کسی نے کہا۔

چیف چند لمحے جواب نہ دے سکا۔ اپنا نام سن کر اسے حیرت ہوئی پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”بول رہا ہوں۔“ خواہ مخواہ حیران ہو رہا تھا۔ اب تک ظاہر ہے، تم لوگ میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو گے۔“

”بابا“ میں عمران بول رہا ہوں۔ وہی عمران جس کے گھر میں اس وقت دندنا رہے ہو۔ اور میں تمہارے گھر سے بول رہا ہوں۔“

”کیا جانتے ہو۔“ سلیم بابا دباڑا۔

”سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہارے قبضے میں تو صرف میری بیوی ہے۔ میرے ریوالتور کی ز پر تمہاری ماں اور دو بہنیں ہیں۔ سودا تمہارے ہی فائدے کا ہے۔“

”تم جھوٹے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ ایک ایک کر کے تینوں سے بات کر لو۔“

سلیم بابا ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات تیزی سے بد

رہے تھے۔ رنگ فق ہوا جا رہا تھا۔

”بابا یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ یہ ماں کی فریاد تھی۔ ”بابا، تم کہاں ہو؟ کیا کر بیٹھے ہو؟“

”بابا بھائی..... یہ آدمی کون ہے؟“ یہ بہن کی آواز تھی۔

”بھائی جان، کیا یہ ہمیں گولی مار دیں گے؟ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ بھائی جان۔“

یہ لازمی چھوٹی بہن رو رہی تھی۔

سلیم بابا کا دل لرزنے لگا۔ ”کو، اطمینان ہو گیا؟“ دوسری طرف سے عمران نے پوچھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ سلیم بابا نے کمزور آواز میں پوچھا۔

”میری بیوی کو کچھ ہوا تو میں تمہارے پورے گھر کو تباہ کر دوں گا۔“

”بتاؤ، میں کیا کروں؟“

”میری بیوی کو پولیس تک پہنچا دو۔ میرے والد مجھے فون کر کے یہ بتا دیں کہ ٹینے خیریت سے ہے اور محفوظ ہاتھوں میں ہے تو تمہارا گھر بھی محفوظ رہے گا۔ اپنے گھر کا فون نمبر تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا کہ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکوں گا۔ یہ کام پہلی فرصت میں کر گزرو۔“

سلیم بابا ہیلو ہیلو چننا رہا لیکن دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا تھا۔ سلیم بابا نے ریسیور چھوڑ دیا پھر اس نے چشمہ اتارا۔ رومال کھول کر چہرے کا پسینہ صاف کیا اور گن ایک طرف پھینک دی۔ اب کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بازی ہار چکا تھا۔

☆=====☆=====☆

عمران نے ریسیور رکھ دیا، ریوالتور ایک طرف پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھامے کرسی پر جا بیٹھا۔ کونے میں کھڑی تینوں خواتین اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں اب بھی خوف تھا۔

بالآخر معمر خاتون نے زبان کھولی۔ ”یہ سب کیا ہے؟ تم شکل و صورت سے تو شریف گھر کے لگتے ہو۔“

”شریف گھر کا لگتا نہیں، ہوں بھی اور خود بھی برا آدمی نہیں ہوں۔“ عمران نے سر اٹھاتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ”میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ لوگ

آرام سے بیٹھ جائیں پلیز۔ یہ ریوالور اصلی نہیں۔ کھلونا ہے۔ میں مجبور تھا اماں۔“
وہ تینوں بیڈ پر ایک دوسرے سے چپک کر بیٹھ گئیں۔ اب وہ قدرے پُر سکون تھیں
لیکن مطمئن اب بھی نہیں تھیں۔

”کیا کیا ہے میرے بابا نے؟“ معر خاتون کے لہجے میں اندیشوں کی پھینکار تھی۔
عمران نے مختصر انہیں سب کچھ بتا دیا۔ وہ تینوں اب رو رہی تھیں اور عمران انہیں
دلاسہ دے رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد فون کی کھنٹی بجی۔ عمران نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو؟“
”بیٹے، ٹینے خیریت سے ہے اور میرے ساتھ ہے۔“ ابو کی جانی پہچانی آواز سنائی
دی۔

”ٹھیک ہے ابو۔ میں آ رہا ہوں۔“ عمران اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا بیٹے؟“ بابا کی امی نے پوچھا۔

”بابا نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔“ عمران کے لہجے میں جچ چچ افسردگی
تھی۔ ”اماں مجھے افسوس ہے۔ میں آپ سے اور ان بہنوں سے شرمندہ ہوں۔ میں نے
آپ کے ساتھ زیادتی کی میں جانتا تھا کہ آپ میرے کہنے پر یوں بھی فون کر سکتی ہیں مگر
اس طرح آپ کے لبوں میں سچا خوف نہ ہوتا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔“
”شرمندہ تو ہم ہیں بیٹے۔“ خاتون نے بمشکل کہا پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے
لگیں۔

عمران تھکے تھکے قدموں سے فلیٹ سے نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

وہ امی کے گھر میں تھے!

”تو اس واردات نے تمہیں سسرال آنے پر مجبور کر دیا؟“ عمران نے کہا۔

”جی نہیں۔ امی کو میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ جس
رات یہ واردات ہوئی ہے، اسی دن میں نے امی کو فون کر کے کہا تھا کہ ہم اگلے جمعے کو
شفٹ ہو رہے ہیں۔“

عمران مسکرایا۔ امی یہ بات اسے پہلے ہی بتا چکی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ
ٹینے نے شادی کے چوتھے دن انہیں رخصت کرتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ

چھ مہینے الگ رہے گی اور پھر اپنی مرضی سے سب کے ساتھ رہے گی۔

”تم اس پر فحشا ہو گی کہ میں نے تمہاری زندگی خطرے میں ڈال دی۔“

”نہیں تو۔ ان حالات میں کون سوچ سمجھ کر فیصلہ کر سکتا ہے آدمی کو کچھ بھائی
نہیں دیتا۔“ ٹینے نے کہا۔ ”بلکہ میں تو شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری زندگی بچائی۔
کیسی ترکیب سوچھی آپ کو۔“

”ٹینے میں نے تمہیں خطرے میں ڈالنے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا۔“ عمران نے
سنگین لہجے میں کہا۔

ٹینے نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!“

”میرے خیال میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ خطرہ صرف مجھے تھا۔ میرا خیال تھا کہ
ڈاکو تم سے واقف ہیں۔“

”میں ابھی نہیں سمجھی؟“

”اب میں تمہیں وہ بات بتا رہا ہوں جس کے بعد تمہاری نظروں سے گر جاؤں گا
لیکن ازدواجی زندگی میں نہ جھوٹ کی گنجائش ہے نہ جیون ساتھی سے کچھ چھپانے کی۔
میں چھپا بھی سکتا تھا لیکن اعتراف کر رہا ہوں اور غیر مشروط طور پر معافی کا خواستگار
ہوں۔“

عمران نے ابتدا سے بتانا شروع کیا۔ ٹینے پہلے حیرت اور پھر تاسف سے اسے دیکھتی
رہی۔ عمران کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

ٹینے کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے عمران کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔
”کیسی باتیں کرتے ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔“

عمران نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کا مضحکہ نہیں اڑا رہی تھی۔ وہ سنجیدہ تھی۔
”یہ سب کچھ تو میری اس بے ہودہ شرط کی وجہ سے ہوا۔ آپ کی کوئی غلطی نہیں۔
میں جچ چچ آپ سے شرمندہ ہوں۔“

اس بار عمران نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

☆=====☆=====☆

سی آئی اے کے افسران بہت خوش تھے۔ انسپکٹر فاروق نے ٹینے مسعود کے گھر
ڈاکے کا کیس حیرت انگیز طور پر حل کر لیا تھا۔ تفتیش کے نتیجے میں لرزہ خیز حقائق سامنے

آئے تھے۔ ثینہ کے کزن خالد نے اس واردات کی منصوبہ بندی کی تھی۔ مقصد صرف مسعود کو ختم کرنا تھا اور ثینہ یہ سب کچھ جانتی تھی۔ اسے بھی شریک جرم کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔

تفتیش کے دوران خالد نے اعتراف کیا تھا کہ وہ ثینہ سے بہت پہلے سے محبت کرتا تھا اور ان کے درمیان تعلقات بھی تھے۔ خالد نے رشتہ مانگا تھا لیکن اقبال صاحب نے انکار کر دیا تھا۔ ثینہ اور خالد شادی کے بعد ملتے رہے تھے۔ اسی لیے ثینہ سسرال سے الگ ہو گئی تھی۔ ڈکیتی کا منصوبہ بھی دونوں نے اتفاق رائے سے بنایا تھا۔ خالد کی نشان دہی پر اس کے ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے تھے۔

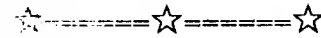
اخبار میں یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد ثینہ نے معنی خیز نظروں سے عمران کو دیکھا۔ عمران نے نظریں جھکا لیں۔ ”اب تو میرا جی چاہتا ہے نام بدل لوں۔“ ثینہ نے کہا۔ ”فضول بات ہے۔ مجھے تو اس نام سے عشق ہو گیا ہے۔“ عمران نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

”صرف نام سے؟“ ثینہ نے شوخی سے پوچھا۔

”ہاں، صرف نام سے۔“

ثینہ بچھ کر رہ گئی۔

”تم سے تو پہلے ہی عشق ہو گیا تھا۔“ عمران نے جملہ پورا کیا۔ دونوں کھل کھلا کر ہنس دیئے۔



رہگذارِ ابد

روح کیا؟ کیا روح کا کوئی وجود ہے؟ عالم ارواح کہاں ہے؟ کیا روہیں انسانوں کے پاس آسکتی ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جو صدیوں سے انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے آرہے ہیں۔ یہ ایک اسرار ہے جس نے ہمیشہ انسان کو اپنی کھوج پر اکسایا ہے۔ اس موضوع پر سائنسی تحقیق کے بارے میں ایک سنسنی خیز کہانی۔ ایک سر پھرے صحافی کا فسانہ حیرت جو روح کا بھید جاننے کے لئے عالم ارواح کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

فاروق مزید ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہ یہاں سے بھی میز کو دیکھ سکتا تھا۔ اسے اعضاء کی تبدیلی کے اس آپریشن کی رپورٹنگ کرنا تھی۔ رپورٹ کا بڑا حصہ تو وہ ڈاکٹر ہریش سے انٹرویو کے فوراً بعد ہی لکھ چکا تھا۔ اب اسے صرف یعنی شاہد کارول کرنا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھ کر اس کی تصدیق کرنا تھی، جو وہ پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ اب اسے اپنے فیچر میں بھرنے کے لیے کچھ حقیقی رنگ درکار تھے۔

اعضاء نکالنے کا مرحلہ شروع ہوا تو اسے ایسا لگا جیسے وہ قصائی کی دکان میں کھڑا ہے۔ ڈاکٹر ہریش اعضاء نکال کر اپنے معاونین کو دیتے ہوئے پکار رہا تھا۔ ”یہ دل لو..... یہ بایاں پھمڑا..... یہ کلیجا..... یہ.....“

آپریشن تھیٹر سے ملحق کمرے میں وہ مریض تھے، جنہیں ان اعضاء کی ضرورت تھی۔ ان کا آپریشن کرنے والے اسٹنٹ سرجن عضو لیتے اور اپنے کام یعنی تبدیلی کے آپریشن میں مصروف ہو جاتے۔ وہ سب اعضاء کی بیوند کاری کے اسپیشلسٹ تھے۔ ”شراب کے عادی لوگوں کا جگر خراب ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر ہریش کام کرتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ ”ایسے جگر بیوند کاری میں کام نہیں آتے۔“ کام ختم کر کے وہ فاروق کی طرف چلا گیا۔ ”کو..... تمہارے لیے ایک اچھا فیچر تیار ہو گیا یا نہیں؟“

”میں اس موضوع پر کئی فیچر کرنا چاہتا ہوں۔“ فاروق نے کہا۔

ایک اسٹنٹ سرجن نے ڈاکٹر ہریش کے بازو کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”تمام اعضاء نکالنے میں اس بار ایک گھنٹا پچیس منٹ لگے۔ دس منٹ کم ہو گئے اس بار۔“

ڈاکٹر ہریش نے اس ستائش پر بے نیازی سے کندھے جھٹک دیئے۔

ایک نرس نے کھوکھلی لاش پر چادر ڈال دی۔ ڈاکٹر ہریش نے چہرے سے سرجیکل ماسک ہٹایا اور فاروق سے کہا۔ ”چلو، تمہیں کافی پلو آؤں۔“

”شکریہ ڈاکٹر، لیکن مجھے فوراً ہی جانا ہے۔“

اپنی کار میں بیٹھ کر فاروق نے ذہن اور نگاہوں سے آپریشن تھیٹر کے منظر کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ نکالے جانے والے اعضاء اس کی نگاہوں میں لہراتے رہے۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ بیوند کاری انسانی زندگی کو بچانے میں معاون ہوتی ہے۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ وہ لیٹ ہو گیا تھا۔ اس نے کار پوری رفتار سے چلائی لیکن ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ گھر پہنچنے میں اسے بیس منٹ لگے۔ گاڑی اندر کھڑی کر

آپریشن تھیٹر میں ہنگامی صورت حال تھی۔ نرسیں اور سرجیکل اسٹنٹ بے حد مصروف تھے۔ ڈاکٹر ہریش چند کے علاوہ کئی اسٹنٹ سرجن بھی وہاں موجود تھے۔ انڈین ٹائمز کارپورٹر فاروق بلال بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

آپریشن ٹیبل پر ایک وجود بکھرا ہوا تھا۔ وہ موت سے جنگ مغلوبہ لڑ رہا تھا۔

ایک میکینیشن کی آواز ابھری۔ ”ای سی جی معدوم ہے، یہ مر چکا ہے۔“

سرجیکل ماسک کے اوپر سے جھانکتی ہوئی ڈاکٹر ہریش کی آنکھوں میں مسکراہٹ سی چمکی۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور لنگڑاتا ہوا ٹیبل کی طرف بڑھا۔ راستے میں جا بجا الیکٹریکل وائر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے مریض کا معائنہ کیا جس کا سر پیٹوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پیٹاں خون آلود تھیں۔ تنفس کی مشین کا ٹیوب اس کے منہ میں لگا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ اٹھایا اور فوراً ہی چھوڑ بھی دیا۔ ہاتھ دھپ سے نیچے ٹیبل پر گرا۔ ہاتھ بے جان تھا۔

ای سی جی کی ٹھہری ہوئی پتلی سی لکیر مریض کی دماغی موت کا اعلان کر رہی تھی۔ تاہم دل اب بھی دھڑک رہا تھا۔ پھیپھڑے تنفس کی مشین اور دیگر آلات کے زور پر بدستور کام کر رہے تھے۔ قانونی اور طبی اعتبار سے موت واقع ہو چکی تھی لیکن جسم اندرونی اعضاء سمیت ابھی زندہ تھا تاکہ اعضاء نکالنے کا کام بخیر و خوبی مکمل ہو سکے۔

”کام شروع۔“ ڈاکٹر ہریش نے اعلان کیا۔ پھر وہ فاروق کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اتنا پیچھے رہ کر تو تم کچھ بھی نہیں دیکھ سکو گے لکھو گے کیا۔“

”شکریہ ڈاکٹر۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ فاروق نے کہا۔ وہ الٹا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”بے ہوش ہونے لگو تو آگے کی طرف نہ گرا۔ ورنہ میں تمہیں بھی کھول دوں گا۔“ ڈاکٹر نے مزاحیہ انداز میں کہا اور ققمہ لگایا۔ پھر اس نے میز سے ایک آلہ جراحی اٹھایا۔

کے اس نے اپنے گھر کو دیکھا۔ اسے اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی ایک خوب صورت بیوی اور ایک پیاری سی بیٹی بھی اس گھر میں رہتی ہے۔ یہ سب کچھ اس نے صرف چند برسوں میں حاصل کیا تھا۔ ورنہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز صفر سے کیا تھا۔

اس کے پردوسی بننے نے اسے دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔ اس نے جواباً ہاتھ لہرایا۔ زرینہ کچن میں سب کے پاس کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ اس نے فاروق کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ”کیا بات ہے جان؟“ فاروق نے اس سے پوچھا۔

”چار گھنٹے کی تاخیر! کہاں تھے تم صبح سے؟“ زرینہ نے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ ”تم میری سمجھ میں نہیں آتے۔ چھٹی لیتے ہو اور اس کے بعد خود ہی کسی کام کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہو۔“

فاروق نے سوچا۔ ”لو، پھر شروع ہوئی وہی کہانی، توجیہات، عذر، الزام اور احساسِ جرم۔“ اس نے زرینہ کو ڈاکٹر ہریش کے آپریشن کی اہمیت کے متعلق بتایا۔ ”اب تم ہی کہو، میں اتنا اہم فیچر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں حکمین سے وعدہ کر کے وعدہ خلافی نہیں کرنی چاہیے۔“

”صبح سردی میں اسی چڑیا گھر کیا لے کر جاتا۔“ فاروق نے تاویل پیش کی۔ ”حکمین کہاں ہے؟“

”آنگن میں کھیل رہی ہے سردی کے باوجود۔“ زرینہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں بتایا۔

فاروق کو شکست کا احساس ہونے لگا۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”اب چلتے ہیں۔ راستے میں، میں دفتر تک کر ایک ضروری چیز دے دوں گا۔“

”نہیں فاروق، یہ نہیں ہو گا۔ میں باقی آدھے دن کی چھٹی گنوانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔“ زرینہ نے جلدی سے کہا۔ ”یہ چالبازیاں تم میرے ساتھ بے شک کر لو، حکمین کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی میں۔“ فاروق نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر زرینہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”دیکھو..... اگر تم نے یہ کہا کہ تم یہ سب کچھ ہمارے ہی لیے کرتے ہو تو خدا کی قسم، میں چیخ پڑوں گی۔ تمہاری عمر ۳۵ سال ہے اور

حکمتیں ان نوجوان کی سی ہیں، جو کچھ بننے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔“

”میں تو صرف اپنی فیلڈ میں نام کمانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ فاروق نے صغلیٰ پیش کی۔

”میں بھی تمہیں بلندی پر دیکھنا چاہتی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہفتے کے ساتوں دن چوبیس گھنٹے کام میں مصروف رہو۔“ زرینہ بولی۔ ”تم خود کو منوانا چاہتے ہو اس میں کوئی بری بات نہیں۔ ماضی کی پرچھائیاں آدمی میں یہ خواہش جگاتی ہی ہیں۔ تم بچپن ہی سے محرومی کا شکار.....“

”یہ بات نہیں۔ میری ماں نے جس وقت مجھے چھوڑا، میں کم از کم چھ سات سال کا تھا۔ دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔“ فاروق کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اس وقت بچے ہی تھے۔ تم یتیم خانے میں پلے بڑھے۔ تمہیں کچھ بھی تو نہیں ملا لیکن اب تمہارا ایک گھر ہے، بیوی ہے، ایک بچی ہے۔ اچھی ملازمت ہے۔ پھر اب خود کو منوانے کے لیے اتنی بھگدڑ کی کیا ضرورت ہے؟“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو زرینہ۔ آئی ایم سوری۔“

زرینہ نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”معذرت قبول کر لی گئی۔ اب تمہیں میری بات ماننا ہو گی۔“

فاروق اس پر جھکا ہی تھا کہ حکمین اچھلتی کودتی آگئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تلج رہی تھی۔ پانچ سالہ حکمین کو دیکھ کر فاروق کا دل محبت اور تفاخر سے بھر گیا۔ اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا۔ ”ہم ابھی اپنی بیٹی کو چڑیا گھر دکھانے لے جائیں گے۔“ اس نے کہا اور سوچا، اعضاء کی پیوند کاری پر فیچر واپس آکر مکمل کر لے گا۔

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر ہریش انڈین ٹائمز کا تازہ شمارہ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت تھی۔ فاروق بلال اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر اپنے آپریشن کے بارے میں مطبوعہ فیچر پڑھ رہا تھا۔ ”تم نے بہت اچھی رپورٹنگ کی ہے فاروق۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”لیکن مجھے شہرت کی کبھی پروا نہیں رہی۔“

فاروق نے کندھے جھٹک دیئے۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر ہریش چند کو شہرت کی کتنی شدید آرزو ہے۔ اسی لیے دوسرے کمرے سے اسے ڈاکٹر کی بیوی کی آواز سنائی دی، جو

فون پر کسی کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ حوالہ انڈین ٹائمز کا وہی فیچر تھا۔

ڈاکٹر مسکراتے ہوئے اٹھا، لنگڑاتے ہوئے ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر فاروق کو دیکھ لیا۔ ”لوگوں میں دوسروں کے کام آنے کا جذبہ ہونا چاہیے۔“ اس نے کہا۔ ”ایک مرتبہ آدی اپنے اعضاء کے ذریعے کم از کم ہیں افراد کو نئی زندگی دے سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ دوبارہ آبیٹھا اور اپنی معذور ٹانگ کو سہلانے لگا۔ اس کی ٹانگ کی یہ خرابی چالیس برس پرانی تھی۔ فاروق اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

”میں کچھ جلدی پیدا ہو گیا۔“ ڈاکٹر ہریش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر آج میں جوان ہوتا تو اس ٹانگ کا علاج ہو چکا ہوتا لیکن اب اس بڑھاپے میں کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“ فاروق نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر ہریش کی مقبولیت میں اس ٹانگ کا بہت بڑا دخل ہے۔

”اگر میرے لڑکپن میں کوئی ڈاکٹر ہریش چند موجود ہوتا تو آج میں اس حال میں نہ ہوتا۔“ ڈاکٹر کے لمبے میں افسردگی تھی۔

فاروق نے تیزی سے موضوع بدلا۔ ”ڈاکٹر..... میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ میں پیوند کاری کے موضوع پر فیچر کی ایک سیرز لکھنا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر ہریش نے کرسی سے ٹیک لگائی اور چند لمبے چھت پر گھورتا رہا۔ پھر وہ سیدھا ہو بیٹھا اور اس نے بولنا شروع کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے نوجوان سرجنوں کو پیوند کاری میں اسپیشلائز کرنے کا مشورہ دیا ہے لیکن پیوند کاری میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ عام طور پر جسم کسی دوسرے جسم کے اعضاء کو مسترد کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں بہتری کے لیے ضروری ہے کہ پیوند کاری کے آپریشن زیادہ سے زیادہ ہوں اور اینٹی ریجکشن دوائیں تیار کی جائیں۔ تبھی یہ سائنس ترقی کر سکتی ہے۔“

فاروق مسکرا دیا۔ ”ممکن ہے“ ڈاکٹر کہ قدرت اسی طرح ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ کہ پیوند کاری غلط ہے، نہیں کی جانی چاہیے۔“

ڈاکٹر کا منہ بن گیا۔ ”امتحانہ خیال ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اس قسم کی باتیں طبی تحقیق کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔“

فاروق، ڈاکٹر کی حس مزاح کی تابانی پر سر پیٹ کر رہ گیا۔ ”میں تو مذاق کر رہا تھا۔“

اس نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔“

☆=====☆

فاروق دفتر پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ اس کے گھر سے فون آیا تھا۔ اس کے علاوہ کسی پیئر جون نے فون کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ دوبارہ فون کرے گا۔ فاروق کو وہ نام جانا پہچانا لگا لیکن پوری طرح سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ پیئر جون کون ہے۔ بہر حال اس نے فوراً ہی زینہ کو جوابی فون کیا۔

”فاروق..... آج کتنی دیر سے آؤ گے؟“ زینہ نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”ایک گھنٹا لیٹ تو ہو ہی جاؤں گا۔ تم اور حکمین کھانا کھا لیتے میرا انتظار مت کرنا۔“

”ایک گھنٹا انتظار تو کیا جا سکتا ہے۔“

”میں جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔“

”میں جانتی ہوں۔“

فاروق نے ریسپور رکھا اور کام میں لگ گیا۔ ٹائپ کرتے کرتے اس کی انگلیاں دکھ گئیں۔ اس نے کچھ دیر کے لیے ہاتھ روکا اور بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ نامور صحافی بننا چاہتا تھا مگر ہر روز گھر واپس جاتے ہوئے اسے مایوسی کا احساس ستاتا تھا۔ مایوسی اس بات پر کہ اسے کوئی بڑی غیر معمولی خبر نہیں ملی جو ہر رپورٹر کا خواب ہوتی ہے۔ سائنس اس کا پسندیدہ مضمون رہا تھا۔ اگر وہ جرئت نہ بنا ہوتا تو یقیناً سائنس داں بننے کے خواب دیکھتا۔ اب بھی اس کے بیشتر فیچرز سائنسی تحقیق اور ارتقاء پر ہی ہوتے تھے۔

رپورٹ مکمل کر کے اس نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائیں اور طویل جملہ لی۔ اس نے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

”فاروق بلال صاحب، آپ سے ملاقات میرے لیے اعزاز ہے۔“

اس نے سر اٹھا کر دیکھ لیا۔ ملاقاتی دراز قد اور بھاری بھر کم تھا۔ چہرے پر جھریاں تھیں۔

فاروق اٹھ کھڑا ہوا۔ ”معاف کیجئے، میں آپ کو.....“

”میرا نام پیئر جون ہے۔ میرا تدفین کا ادارہ ہے۔“ ملاقاتی نے کہا۔

”اوہ..... یاد آیا۔ جی ہاں..... آپ کا پیغام ملنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی مگر مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ آپ کون ہیں۔“

ہے انہوں نے بتایا کہ وہ تھلی کی طرح ہلکے ہلکے ہو گئے تھے اور وہ جس دنیا میں تھے وہاں خوشیاں ہی خوشیاں سکون ہی سکون تھا۔

”جی..... جی ہاں۔“ فاروق نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔ اسے یہ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کا ملاقاتی جن لوگوں کے حوالے دے رہا ہے وہ مریض تھے اور ان کی بات کو سند کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف وہ پیٹر پر برہم بھی نہیں ہو سکا تھا۔ وہ بڑے اعتماد اور ذہانت سے اپنا متوقف لفظوں میں بیان کر رہا تھا۔ پھر اچانک وہ یوں اٹھا جیسے ملاقات ختم ہونے کا اعلان کر رہا ہو۔ ”ٹھیک ہے مسٹر پیٹر۔ میں اس سلسلے میں اپنے ایڈیٹر سے بات کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”مسٹر فاروق، انہیں بتانا کہ مرنے والوں کو ان کے استحقاق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ پیوند کاری کے سرجن جو کچھ کر رہے ہیں اسے قتل اور آدم خوری کا استرجاع کہا جانا چاہیے۔ اگر آپ اپنے اخبار کے ذریعے اس درندگی کو روک سکے تو میں سمجھوں گا میری زندگی کسی کام آگئی۔“

فاروق نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ پڑ گوشت مگر بے حد سرد اور گرفت سے محروم تھا۔ وہ کسی فرد کے ہاتھ معلوم ہوتا تھا۔

☆=====☆=====☆

پیٹر جون سے ملاقات کا احوال کانڈ پر منتقل کرنے میں اور دیر لگ گئی۔ لیٹ تو وہ بے ہی ہو گیا تھا۔ اسے ڈر یہ تھا کہ کہیں زہینہ اور تمکین اس کے انتظار میں بھوکی نہ بچی ہوں۔ اس نے پیٹر جون کا انٹرویو اپنے ایڈیٹر کی میز پر رکھا اور دفتر سے نکل آیا۔ سامنے ہی کھلونوں کی دکان تھی۔ اس نے دکان سے بھس بھرا ہوا ہاتھی خریدا جو اپنی انھی الٹی سوئڈ سمیت تین فٹ اونچا تھا۔

ایک ہاتھ میں برلیف کیس اور دوسرے ہاتھ میں وہ ہاتھی لیے اپنے گھر میں داخل رہا۔ زہینہ کھانے کی میز پر بیٹھی تھی۔ اس نے زہینہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ مگر اس کی آنکھوں میں برہمی نہیں تھی..... رحم تھا، ہمدردی تھی۔ اس کے سامنے چائے کی پیالی تھی جس کی چائے جانے کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

”آئی ایم سوری زری!“ فاروق نے کہا۔

”نہیں فاروق۔ شرمندہ تو میں ہوں۔ میں نے تمہیں اتنی زیادہ محنت کرنے کی

”میں آپ کی رپورٹس بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ بہت اچھے صحافی ہیں۔“
”بس جی یہ تو روزی ہے۔“ فاروق نے کہا۔ ویسے اپنی تعریف سننا اسے اچھا لگا تھا۔ ”کیسے؟ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میں نے پیوند کاری کے موضوع پر آپ کا ایک فیچر پڑھا ہے۔“ پیٹر جون نے کہا۔
”اور میں آپ کے اخبار کے توسط سے عام لوگوں تک ایک ہم بات پہنچانا چاہتا ہوں۔“
فاروق نے دکھاوے کے لیے پیڈ اور پنسل منبھلی، حلالانکہ وہ بہت بیزاری محسوس کر رہا تھا۔ ”جی..... فرمائیے۔“

”میں وہ بات سامنے لانا چاہتا ہوں جو تیس سال سے چھپائے بیٹھا ہوں۔“
”اگر وہ اتنی ہی اہم بات تھی تو آپ نے اتنے عرصے لب کیوں سے رکھے؟“
فاروق نے اعتراض کیا۔

پیٹر پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ چہرے پر زردی بکھر گئی۔ اس نے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور بولا۔ ”بعض باتیں مناسب وقت پر ہی ظاہر کی جاتی ہیں۔ اس بات کے لیے یہی مناسب ترین وقت ہے۔ میرا خیال ہے پیوند کاری کے آپریشن روح کی روائگی کے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں۔“

”تو یہ ہے وہ اہم بات؟“ فاروق نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
”دیکھیے..... فردے کو جلانا ہو یا دفن کرنا ہو، میں یہ کام چوبیس گھنٹے سے پہلے نہیں کرتا۔ تاکہ روح بغیر کسی رکاوٹ کے اپنے سفر پر روانہ ہو جائے۔“ پیٹر آگے کو جھکتے ہوئے رازداری سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ یہی کہ میں اس سے زیادہ انتظار کیوں نہیں کرتا۔ بات یہ ہے مسٹر فاروق کہ میں یہ کام برسوں سے کر رہا ہوں۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ بے حد وسیع ہے۔ میرے نزدیک مناسب ترین مہلت چوبیس گھنٹے کی ہے۔ میں لاش آراستہ کرنے کے بہانے یہ مہلت حاصل کرتا ہوں۔“

فاروق نے سر کھینچا۔ سر جھکا کر مسلسل ٹائپ کرنے سے اس کی گردن دکھنے لگی تھی۔ ”مسٹر پیٹر روح کی روائگی تو دور کی بات ہے، آپ نے اب تک روح کی موجودگی بھی ثابت نہیں کی ہے مجھ پر۔“

”پچھلے دو تین برسوں میں ایسے سیکڑوں کیس سامنے آئے ہیں جن میں لوگوں کو مردہ قرار دے دیا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ جی اٹھے۔ ایسے لوگوں نے اپنا تجربہ بیان کیا

اجازت کیوں دی۔

اس بار زریںہ نے جنگی حکمت عملی تبدیل کر دی تھی۔ فاروق نے اسے نظر انداز کیا اور جلدی سے موضوع تبدیل کر دیا۔ اس نے بھس بھرا ہاتھی سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے راستے میں رک کر تمکین کے لیے خریدا ہے۔“

”میرا خیال ہے، اسے ان چیزوں سے زیادہ باپ کی ضرورت ہے۔“

اب کے فاروق کو اس کی نگاہوں میں برہمی نظر آئی۔ ”دیکھو زریںہ ڈیر میں نے واقعی جلدی آنے کی کوشش کی تھی۔“ اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔ ”ہم تو تمہارے ساتھ کھانا کھانے کو ترس گئے ہیں۔“ زریںہ نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ”تم چھٹی کے دن بھی ہمارے نہیں ہوتے۔ بات کیا ہے فاروق؟ کام اتنا اہم ہے تمہارے لیے؟“

”زریںہ..... پھر وہی سب کچھ دہراؤ گی۔ دیکھو..... یہ مصروفیت کے دن ہیں۔ پھر کچھ لوگ چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔“

”نہیں، تم شروع ہی سے کام کے عاشق ہو۔ میں نے اپنے لیے کبھی شکایت نہیں کی لیکن میری تمکین بڑی ہو رہی ہے اب، اور اس کا باپ اس کے لیے اجنبی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔“

”تمکین سو گئی کیا؟“ فاروق نے پھر اس کا دھیان بنانے کی کوشش کی۔

”میرا خیال ہے، نہیں۔“

فاروق بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ ”تمکین تم جاگ رہی ہوتا؟“ اس نے پکارا۔ ”ڈیڈی..... آپ نے کھانا ہمارے ساتھ نہیں کھایا۔“ اندر سے تمکین کی آواز سنائی دی۔

”بنیا رانی..... میں تمہارے لیے ایک چیز لایا ہوں۔ اب میں دیر سے آؤں گا تو یہ تمہارے ساتھ رہے گا۔“ فاروق نے لائٹ آن کر دی۔

تمکین چند لمبے حیرت سے پلکیں جھپکاتی رہی، پھر خوشی سے چلائی۔ ”ارے واہ..... اتنا بڑا ہاتھی! یہ زندہ ہے نا ڈیڈی؟“

”نہیں۔“ فاروق نے پلٹ کر زریںہ کو دیکھتے ہوئے کہا جو اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ”اس میں بھوسا بھرا ہوا ہے، یہ بہت اچھی چیز ہے۔“ فاروق نے ہنسنے

ہوئے کہا۔ ”اب میں اسے تمہارے پاس لٹا رہا ہوں۔ سو جاؤ آرام سے۔“

کمرے سے نکلتے ہوئے فاروق نے زریںہ سے پھر معذرت کی۔ ہمیشہ کی طرح زریںہ پھر نرم پڑ گئی۔ ”کچھ خاوند شراب پیتے ہیں۔ کچھ آوارگی کرتے ہیں، کچھ جوا کھیتے ہیں۔ مجھے ایک ایسا شوہر ملا ہے، جسے کام کی لت ہے۔ یہ تو مقام شکر ہے اور میں ناشکری شکایت کر رہی ہوں۔“

”تم شکایت کہاں کرتی ہو۔“ فاروق نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”خیر..... میں طانی کر دوں گا۔ اس عید پر ہم بمبئی چلیں گے تمہارے گھر اور ہوائی جہاز سے چلیں گے۔“

زریںہ کا چہرہ چمکنے لگا۔ ”سچ کہہ رہے ہو؟ وعدہ؟“

☆=====☆=====☆

ایڈیٹر سلیل گپتا نے انٹرویو کی روداد والے کانڈ اس ٹرے پر رکھ دیئے، جس پر التوا کی سِلپ چسپاں تھی۔ ”میرے خیال میں یہ نہیں چھپنا چاہیے۔“ اس نے فاروق سے کہا۔ فاروق کو امید بھی یہی تھی۔ پھر بھی اس نے کہا۔ ”اس کی کوئی وجہ، کوئی جواز بھی ہو گا؟“

”ہاں۔ یہ چھپنے کے بعد میرا، تمہارا، ہمارے اخبار کا اور خود پیئر جون کا خوب مذاق اڑے گا۔ اس کے علاوہ یہ ہمارے قارئین کے لیے باعث توہین ہو گا۔ ہمیں یہ خرافات قارئین پر تھوپنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”لیکن ہمیں اسے اشاعت سے روکنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ ہم سنسر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے، ہمارے قارئین تک یہ بات پہنچنی چاہیے۔“

سلیل کا سر اثبات میں ہلا۔ مگر فوراً ہی اسے خیال آگیا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ بات کہ روجوں کی رواگلی کا بھی شیڈول ہوتا ہے۔“ اس نے مضحکہ اڑایا۔ ”تم خود بتاؤ، فاروق، کیا تم اس پر یقین رکھتے ہو؟“

”میرے یقین کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے قارئین میں سے بہت سے ایسے ہوں گے، جو اس پر یقین کریں گے ویسے بھی تقریباً ہر مذہب یہی بتاتا ہے۔“ سلیل نے کان کھاتے ہوئے کہا۔ ”اب اس کا فیصلہ پرکاش صاحب ہی کریں گے۔“

کے خلاف سازش ہے.....

مگر فالو اپ کے نکتہ نظر سے سب سے زور دار خط پشاپو دھری کا تھا۔ پشاپو دھری اپنی پیش گوئیوں کے حوالے سے بہت مشہور تھی۔ اس نے لکھا۔

مادی دنیا سے حقیقی دنیا تک کا سفر طویل بھی ہے اور دشوار بھی۔ اس سفر میں مداخلت یقیناً ضرر رساں ثابت ہو سکتی ہے۔ کیا پتا، جنہیں ہم بھوت پریت کہتے ہیں، وہ دراصل روہیں ہوں، جو کسی وجہ سے اپنی منزل تک نہ پہنچ سکی ہوں۔ میں اعضاء کی پیوند کاری کے آپریشن کا سلسلہ روکنے کے لیے حکومت سے رابطہ کر رہی ہوں.....

فاروق نے وہ خط کوٹ کی جیب میں ڈال دیے۔ وہ ان تینوں افراد سے انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ اپنی میز پر واپس آکر اس نے تینوں کے پتے اور فون نمبر اپنی ڈائری پر نوٹ کیے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آغاز پشاپو دھری سے کرے گا۔

سب سے اہم مسئلہ وقت کا تھا۔ یہ کام اسے اپنے طور پر اپنی فرصت کے اوقات میں کرنا تھا۔ یعنی اتوار کے دن اور ان تینوں میں سے کسی کو کال کرنے سے پہلے اسے زہینہ کو بتانا ہو گا۔ اسے اندازہ تھا کہ زہینہ کا رد عمل کیا ہو گا لیکن عید کی چھٹیوں میں گھر جانے کی رشوت سے اسے بلایا جاسکتا تھا۔

☆=====☆=====☆

پشاپو دھری نے بڑی چونکا دینے والی پیش گوئیاں کی تھیں، جن میں سے بیشتر ثابت ہوئی تھیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی وہ مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت کے حوالے سے کافی مشہور ہو چکی تھی۔ اس شہرت ہی نے اسے ٹی وی کے ایک اسٹیج شو میں لوک سمبا کے ممبر انیل چودھری سے ملوایا۔ جلد ہی دونوں کی شادی ہو گئی۔ انیل چودھری کی موت نے اسے خوش حالی بھی دے دی۔

فاروق نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت حسین اور متناسب الاعضاء تھی۔ اس نے لباس بھی اپنی خوبصورتی کو نمایاں کر کے عیاں کرنے والا پہنا تھا۔ تیز خوشبو اس پر مستزاد تھی۔ پیچھے ایک سیاہی ملی بیٹھی تھی۔

اس کا اشارہ بلیشر کی طرف تھا۔ اس نے انٹرکام ریسپور اٹھایا، بزر دہلیا اور چند لمبے بات کرنے کے بعد ریسپور رکھ دیا۔ ”ٹھیک ہے، فاروق تم جیتے۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”پرکاش صاحب نے کہا ہے کہ اسے پوری سنجیدگی اور اختصار کے ساتھ بیک پیج پر چھاپا جائے۔“

☆=====☆=====☆

پیٹر جون کا انٹرویو چھپنے کے بعد فاروق یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حریف اخباروں نے اگلے روز اسی کہانی کو فرنٹ پیج پر چھاپا ہے۔ پھر سلیل نے اسے بتایا کہ اس سلسلے میں اتنے خط آئے ہیں کہ پچھلے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے ہیں۔ ”لیکن میں لیٹرز ٹو دی ایڈیٹر میں ان میں سے ایک خط بھی نہیں چھاپوں گا۔“ سلیل نے آخر میں کہا۔ ”تم جا کر دیکھو تو۔“

فاروق میل روم کی طرف چلا گیا۔ انڈین ٹائمز کو ہر روز سیکڑوں خط موصول ہوتے تھے۔ ان میں سے پانچ چھ اشاعت کے لیے منتخب کر لئے جاتے تھے۔ سلیل ان خطوط کو ترجیح دیتا تھا جن میں ادارے سے مدلل انداز میں اختلاف کیا گیا ہو یا اخبار کی پالیسی پر تنقید کی گئی ہو۔

فاروق نے سرسری انداز میں خطوط کا جائزہ لیا۔ بیشتر خطوط میں پیٹر جون کے نکتہ نظر کو سراہا گیا تھا۔ کچھ خطوط میں اسے پاگل قرار دیا گیا تھا۔ فاروق نے دلچسپ خطوط علیحدہ کر لیے۔ اس نے ان خطوط کو دوبارہ پڑھا۔ ایک خط پادری جوزف گل کی طرف سے تھا۔

ایسے لوگ بھی ہوں گے، جو مسٹر پیٹر جون کا مضحکہ اڑائیں گے لیکن یہ عقیدے کا معاملہ ہے، روح کا وجود برحق ہے اور روح غیر مرئی ہوتی ہے جو حقیقت ہے، اسے روشن خیالی کے نام پر مسترد نہیں کیا جاسکتا.....

ایک اور خط ٹام ہنری کا تھا، جو دہریہ تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

میں حیران ہوں کہ اس قسم کی خرافات اتنے بڑے روزنامے میں کیوں شائع کی گئی۔ اس دور میں توہمات کو اتنی اہمیت دینا کسی اعتبار سے درست نہیں۔ یہ خط انسانیت اور اس کے ارتقاء

فاروق نے جیب سے نوٹ بک اور پنسل نکالی۔ وہ سامنے بیٹھی ہوئی پشپا کے بدن سے نظریں ہٹا کر اپنی توجہ کام پر مرکوز کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس نے انٹرویو پر رضامند ہونے پر پشپا کا شکریہ ادا کیا لیکن پشپا کے پُرکشش جسم سے نظریں چرانا اس کے لیے کاردار ثابت ہو رہا تھا۔

”چودھری جی، اب بھی میری رہنمائی کرتے ہیں۔“ پشپا نے کہا۔ ”انہوں نے لگتا تھا کہ مجھے تم سے بات کرنی چاہیے۔“

”آپ کا مطلب ہے، آنجنابی چودھری سے آپ کا اب بھی رابطہ ہے؟“ فاروق اپنے لہجے کی حیرت نہ چھپا سکا۔

”ہاں..... کیوں نہیں۔“ پشپا نے اس کی حیرت سے محفوظ ہوتے ہوئے کہا۔

فاروق ان سب باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اسے تو اس پر بھی شک تھا کہ کوئی مستقبل میں جھانک سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک منطقی ذہن صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے مستقبل کے بارے میں اندازے لگا سکتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پشپا کی پیش بینی پر یقین رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں۔

پشپا نے اسے سوچتے دیکھا تو مسکرائی اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ایک طرح کی جنگ تھی۔ فاروق بھی پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اسی وقت ایک ملازمہ چائے لے آئی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد پشپا نے کہا۔ ”تم اپنے فیچر میں مجھے معمول نہ لکھنا۔ میں خود کو پیش بین کہلوانا پسند کرتی ہوں۔“

”لیکن آپ نے بتایا کہ انیل چودھری سے آپ کا رابطہ ہے۔ اس اعتبار سے تو آپ معمول ہی ہوئیں۔“

”میرا رابطہ تحریر کے ذریعے ہے۔ اس میں آدمی روح کے زیر اثر قلم برداشتہ سوچے سمجھے لکھتا چلا جاتا ہے۔“ پشپا نے وضاحت کی۔ ”انیل چودھری مجھ سے لکھواتے ہیں، مجھے بتاتے ہیں کہ دوسری دنیا کیسی ہے۔“

”کیسی ہے دوسری دنیا؟“

”تم مضحکہ اڑا رہے ہو مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں شکوک سے میرا ہر روز رابطہ رہتا ہے۔“ وہ مسکرا کر خطرناک زاویے سے فاروق کی طرف جھکی۔ فاروق کا دل اتھل پھٹھل ہونے لگا۔ اس نے گھبرا کر پلکی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”خوب صورت ملی ہے۔“

”یہ اپنی ماں پر گئی ہے۔ اس کی ماں کی راکھ میں نے اس جار میں محفوظ رکھی ہے۔“ پشپا نے شوکیں میں رکھے جار کی طرف اشارہ کیا۔

”گویا آپ نے اپنی بلی کی چتا جلائی تھی۔“ فاروق نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ پیڑ جون سے اتفاق کرتے ہوئے آپ نے اسے کم از کم چوبیس گھنٹے بعد جلایا ہو گا۔ تاکہ اس کی روح کو نکلنے کے لیے مناسب مہلت مل سکے۔“

”مذاق اڑا رہے ہو میرا؟“ پشپا کی بھوئیں تن گئیں۔

”جی نہیں۔ میں تو ایک زور دار فیچر کے لیے مواد جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ فاروق نے جواب دیا۔ ”ویسے آپ کے خیال میں کسی مردے کو جلا کر ہم اس کی روح کے راستے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کرتے؟“

”میرا خیال ہے، آتما کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آتما چمک دار اور ان مٹ ہوتی ہے۔“

”تو پھر اعضاء نکالنے ہی سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔“ فاروق نے اعتراض کیا۔

پشپا کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ ”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی میں نے روح کی قوت کے بارے میں جو کچھ کہا، اس کے بارے میں بھی بہت زیادہ پریقین نہیں ہوں لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ آتما کو عافیت کے ساتھ رخصت ہونے کا موقع ضرور ملنا چاہیے۔“

فاروق نے بڑی مشکل سے اپنے استعجاب پر مسکراہٹ کا پردہ ڈالا۔ اس کی سمجھ میں پشپا کی بے بسی تو آ رہی تھی لیکن یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عورت کو اتنے معتقدین کیسے مل گئے۔

پشپا نے جیسے اس کے ذہن کو پڑھ لیا۔ ”تم اپنے فیچر میں مجھے مضحکہ خیز بنا کر تو نہیں پیش کرو گے؟ رپورٹر بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ تم تو ایسے نہیں ہونا؟“ اس کے لہجے میں خوف تھا۔ ”ویسے تم پُرکشش آدمی ہو۔“ اس کی آنکھوں میں ترغیب کی چمک لہرائی۔

”آپ نے میرا ذہن ٹھیک طرح سے نہیں پڑھا۔ مجھے کوئی رشوت نہیں چاہیے۔“

”مجھ میں ذہن پڑھنے کی صلاحیت نہیں۔ البتہ تمہارے جسم کی خوشبو سے تمہارے متعلق بہت کچھ جان سکتی ہوں۔“

”مثلاً؟“

”تم طبعاً مہربان اور نرم ہو۔ اندر کی دنیا میں گمن رہنے والے ہو لیکن اکثر ضد اور

☆=====☆=====☆

کوئی بھی نہیں تھا۔ فاروق نے ٹام کو سہارا دے کر اٹھایا۔ پولیس والا بے نیازی سے دوسری طرف چلا گیا۔

ٹام ہنری کا گھر قریب ہی تھا۔ فاروق اسے گھر لے گیا۔ اس نے اپنا تعارف بھی کرایا۔

”تم اخبار والے ہی اس جمالت کے ذمے دار ہو۔ صرف سنسنی کی خاطر روحوں کی کہانیاں چھاپ دیتے ہو۔ میں ہر اتوار کو چرچ کے باہر اس جمالت کے خلاف جہاد کرتا ہوں۔“

”مسٹر ہنری..... اخبار کچھ اور نہیں، معاشرے کا آئینہ ہوتے ہیں۔“ فاروق نے بے حد رساں سے کہا۔

ٹام نے اپنی زخمی تھیلی کی خود ہی ڈریننگ کی۔ ”یہ بتاؤ مسٹر فاروق کہ مجھے یہ سب کچھ کر کے کیا حاصل ہوتا ہے؟“ ٹام نے کہا۔ ”مجھے کوئی لالچ نہیں۔ بس یہ اطمینان ملتا ہے کہ میں انسانوں کے دماغ کے پھوٹوں کا بساط بھر صفایا کر رہا ہوں اور جب سے تمہارے اخبار نے روح والا چکر چلایا ہے، میرا کام دشوار ہو گیا ہے مجھے گالیاں سننا پڑتی ہیں۔ حکام کو اجتماعی درخواستیں مری جا رہی ہیں کہ مجھے بند کر دیا جائے فون پر دھمکیاں الگ دی جاتی ہیں۔ لکھافوں میں غلاطت بھر کر بائی پوسٹ بھیجی جاتی ہے مجھے۔ یہ سب روحانیت والوں کی حرکتیں ہیں۔ یہ ابدیت پسند وہ چیز فروخت کر رہے ہیں لوگوں کے ہاتھوں، جو سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ روحانیت کا چکر چلانے والے شعبے باز بھی میرے پیچھے پڑ گئے ہیں لیکن میں اس طرح ہارنے والا نہیں ہوں۔“

”ٹی وی پر مناظرے کا موقع مل جائے تمہیں تو کیسا رہے؟“ فاروق نے پوچھا۔ ”بھاسکر شو کا کمپیئر ولیپ بھاسکر میرا اچھا دوست ہے۔ تمہارا کسی پادری یا روحانیت پسند سے مناظرہ کرایا جاسکتا ہے بھاسکر شو میں لیکن اس کے صلے میں تمہیں مجھے خصوصی انٹرویو دینا ہو گا اور شرط یہ ہے کہ کسی اور صحافی سے تم بات بھی نہیں کرو گے۔“

”مجھے منظور ہے۔ میں مذہب کے پیٹ پر پوری قوت سے لات مارنا چاہتا ہوں۔“ ٹام ہنری کے چہرے پر درندگی کا تاثر تھا۔ فاروق کو وہ خطرناک دیوانہ معلوم ہوا۔

☆=====☆

پادری جوزف گل کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پیدا انٹی طور پر تشویش کا مریض

ہے۔ فاروق کی بات سن کر وہ بے تابانہ ٹھٹھا رہا۔ پھر اس نے قدم روکے اور شہت سے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں مسٹر فاروق یہ ممکن نہیں۔ دہریے سے ٹی وی پر مناظرہ اسے خواہ مخواہ پہنچی دے گا، جو اسے دیے نہیں مل سکتی۔“

”ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ روحانیت کی تبلیغ و ترویج کے خواہش مند ہیں۔“ فاروق نے احتجاج کیا۔ ”ٹی وی سے بہتر تبلیغ کا اور کون سے موقع مل سکتا ہے آپ کو؟ اور آپ تو ٹھیک طرح سے مقابلہ کیے بغیر ہی جیت جائیں گے۔ عام لوگ دہریوں سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کے سخت خلاف ہیں وہ۔ وہ آپ کی بات توجہ سے سنیں گے اور سراہیں گے۔“

”نہیں مناظرہ کوئی اچھی چیز نہیں اور دہریوں سے مناظرہ تو ہوتا ہی مشکل ہے۔ وہ عجیب منطق نکال کر لاتے ہیں اور ان جیسے لوگ اس منطق پر تالیاں پیٹتے ہیں۔“

”تو آپ بھی انہیں اسی زبان میں جواب دیں۔“

”مسٹر فاروق، ہم مذہبی رہنما ہیں، کوئی سیاست داں نہیں۔ تم روحانیت کے بارے میں کچھ جاننے بھی ہو؟“

فاروق نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس کے ماننے والے روح پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے خیال میں مرنے والے سے رابطہ ممکن ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے پیٹر جون بھی روحانیت پسند ہے، جس کا انٹرویو ہم نے چھلپا تھا۔“

”ہاں۔ پیٹر جون میرا اچھا دوست بھی ہے۔“

”ابھی کچھ دیر پہلے میں اور ایک روحانیت پسند..... پشپا سے ملا تھا۔“ فاروق نے کہا۔

پادری کا منہ بن گیا۔ ”ہاں..... وہ بہت حساس اور خداداد صلاحیت کی مالک عورت تھی لیکن اس نے اپنی صلاحیت کو مادی مقاصد کے لیے استعمال کیا تو اس سے وہ صلاحیت ہی چھن گئی۔ اس کی ہوس اس کی صلاحیت کو کھا گئی۔“

”تو قادر، میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ ٹام ہنری سے مناظرہ نہیں کریں گے تو میں روحانیت پسندوں کی نمائندگی پشپا کو سونپ دوں گا۔“

پادری جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نہیں..... تم ایسا نہیں کرو گے۔“

”دیکھیے۔ لوگوں کا علم بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔ آپ تعاون نہیں کریں گے

ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا۔“ فاروق نے کہا۔ ”چلیں..... پیڑ جون کو رضامند کر سکتے ہیں۔“

”وہ بیمار رہتا ہے۔“

”تب تو ہمیں پشاپی سے مدد لینا ہو گی۔“

”میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ پادری نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر فوراً ہی نرم پڑ گیا۔ ”ٹھیک ہے، میں پیڑ سے بات کروں گا۔ امید ہے وہ رضامند ہو جائے گا۔“

☆=====☆=====☆

مولوی نعمت بڑے جلال والے بزرگ تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ انہوں نے فاروق کی بات سن کر اسے گھورا اور بولے۔ ”نام سے تو مسلمان معلوم ہوتے ہو لیکن ایمان کا مطلب نہیں سمجھتے۔ میاں، یہ عارضی زندگی ہے۔ یہ اس لیے کہ آدمی ابدی زندگی کے لیے نیک کمائی کر لے تاکہ وہاں اچھی گزرے اور روح اللہ کا راز ہے، اس کے بارے میں تجسّس کو منع کیا گیا ہے۔“

”لیکن اسلام نے تو حصولِ علم کو جہاد قرار دیا ہے اور بے خبری کو لعنت۔“

”مگر کچھ چیزوں کے لیے خاص حکم ہے کہ ان پر آنکھیں بند کر کے دل سے یقین کیا جائے۔ دماغ کی پروا کیے بغیر۔“

”تو آپ مناظرے میں حصہ نہیں لیں گے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام دینِ کامل ہے جو بے خبر ہیں، انہیں تجسّس کرنے دو مجھے تو اس پر حیرت ہے کہ تم مسلمان ہو کر اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

فاروق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ ”میں یتیم خانے میں پلا بڑھا ہوں۔ صرف ماہے کو جانتا ہوں۔ مجھے کبھی کسی نے روح کے متعلق..... اسلام کے متعلق نہیں بتایا۔“

میرے نزدیک مذہب محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا شعبہ۔“

”خوش قسمت ہو کہ مسلمان پیدا ہوئے۔ خوش نصیب ہو کہ بلا آخر تمہیں راہِ راست پر آنا ہے۔ یاد رکھو، روح کو کوئی قید نہیں کر سکتا۔ یہ راز کوئی نہیں پا سکتا۔“

مولوی صاحب نے اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایمان میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔“

اگلے روز پیڑ جون نے فون کر کے فاروق کو مطلع کیا کہ وہ ٹام ہنری سے مناظرے

کے لیے تیار ہے۔ فاروق احساسِ فتح سے سرشار ہو گیا۔ اب صرف شیڈول کی تیاری کرنا تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس پروگرام کے بارے میں ایک پیشگی فیچر تیار کرنا چاہتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی اخبار اور کسی صحافی نے کوئی موضوع تخلیق کیا تھا۔ اسے امید تھی کہ سیل گیتا اس پر کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔ موضوع عام لوگوں کی دلچسپی کا تھا اور اس سے اخبار کی اشاعت کہیں کی کہیں پہنچ سکتی تھی۔

وہ یہ سوچ رہا تھا کہ سیل گیتا کی طرف سے بلاوا آگیا۔ ”فاروق..... تمہیں ایک سلسلے وار فیچر پر کام کرنا ہے۔ فرنٹ جیج فیچر ہو گا وہ، اور اس کی اشاعت یکم جنوری سے شروع ہو گی۔“ سیل نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

فاروق کا دل خوش ہو گیا لیکن افسوس بھی ہوا کہ بھاسکر شو کا پروگرام مؤخر کرنا پڑے گا۔ ”فیچر کس موضوع پر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”زندگی اور موت پر۔ زندگی کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم ہوتی ہے۔ موت کی قانونی اور طبی اعتبار سے کیا تعریف ہے۔ موت کی سائیکوجی اصل موضوع ہے۔ اس میں آؤ اگوں کا بے نگل بھی آئے گا۔“

فاروق نے سر کو تفسیمی جنبش دیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ مناظرہ بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔

”اس فیچر پر فوراً کام شروع کر دو۔ یہ ہمیں بہت جلد چاہیے۔“

فاروق خوش تو تھا کہ اس موضوع پر عرصے سے کام کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب ایک مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ عید پر زرینہ اور تمکین کو بمبئی نہیں لے جا سکتا تھا۔

☆=====☆=====☆

زرینہ نے فاروق کو بغور دیکھا اور بولی۔ ”اب خلافِ معمول دوپہر کے وقت آنے کی وجہ بھی بتا دو۔“

فاروق کی سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیسے شروع کرے۔ ”زرینہ..... سیل گیتا نے مجھے ایک بہت بڑا کام سونپا ہے، جو مجھے کہیں کا کہیں پہنچا سکتا ہے۔“ بلا آخر اس نے اشارت لیا۔ ”میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔“

”تو انکار کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”فیچر کی اشاعت یکم جنوری سے شروع ہو گی۔ یہ کام ارجنٹ ہے۔ ہم بمبئی نہیں جا

کیس گے۔

”یہ یہ کام چھوڑ دو۔ اس اخبار کے لیے تم پہلے ہی بہت کچھ کر چکے ہو۔ سیل سے کہو یہ فیچر کسی اور سے لکھوا لے۔“

فاروق نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دو وجوہات کی بناء پر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ایک تو میں پہلے ہی ہائی بھر چکا ہوں اور پھر اس کی بات ٹلی نہیں جاسکتی۔“

”لیکن تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔“

”جانتا ہوں اور وعدہ خلافی پر شرمندہ ہوں۔ ایسا کرو، تمہیں کو لے کر بمبئی چلی جاؤ۔ چھٹیاں گزار کر واپس آجانا۔“ فاروق نے کہا۔ زرینہ خاموش رہی تو وہ جھنجھلا گیا۔ ”دیکھو زرینہ..... میں دیانت داری سے اپنا کام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آخر تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟“

”میں چاہتی ہوں، تم وہ وعدے نہ کرو، جنہیں وفانہ کر سکو۔ میں چاہتی ہوں، تم کام کے پیچھے پاگل نہ ہو جاؤ۔ میں چاہتی ہوں، تم تمہیں کو اچھے باپ بن کر دکھاؤ۔“ زرینہ کی آواز بلند ہو گئی۔ ”اور میں چاہتی ہوں، تم میرے لیے اچھے شوہر ثابت ہو۔“

”تم بمبئی چلی جاؤ۔ تفریح کرو اور مجھے میرا کام کرنے دو۔“ فاروق نے جھنجھلا کر کہا۔

”میں بمبئی جا رہی ہوں۔“

”اور واپسی کے لیے جلدی کی کوئی شرط نہیں۔“

”یہ کس نے کہا کہ میں واپس آنے کے لیے جا رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھ پر کوئی احسان کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔“

☆=====☆=====☆

ٹائپ کرتے کرتے فاروق نے کئی بار ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن یہ سوچے ہوئے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لیا کہ ایک پیرا گراف اور ٹائپ کر لوں۔ ورنہ خیال ذہن سے نکل جائے گا۔ کام نمٹانے کے بعد اس نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ زرینہ اور حمکین کے جانے سے کام آسان ہو گیا تھا۔ کام کی رفتار بھی تیز ہو گئی تھی لیکن وہ انہیں بہت زیادہ یاد بھی کرتا تھا۔ اب تو ایک ہفتے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ جس روز زرینہ نے کہا تھا کہ وہ کبھی واپس نہ آنے کے لیے بمبئی جا رہی ہے، اس رات وہ گھر پہنچا تو اس کے پردی سے بچنے نے اسے روک لیا۔ بچے کے کان بہت تیز تھے اور وہ دوسروں کے بارے میں بہت

زیادہ تجسس کرتا تھا۔ اس نے فاروق کو بتایا کہ زرینہ تمہیں کو لے کر نیکی میں بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ دو بڑے سوٹ کیس بھی تھے۔ اس نے پوچھا بھی کہ کہاں جا رہی ہو مگر زرینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس دن کے بعد سے فاروق کا اب تک زرینہ سے رابطہ نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بھی پریشان ہوگی مگر اس کی طرح وہ بھی انتظار کا کھیل کھیل رہی تھی۔ دونوں فون کرنے میں پہل کرتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ دونوں کے نزدیک فون کرنے کا مطلب اپنی غلطی تسلیم کرنا تھا۔ اس معاملے میں دونوں بچے ہی تھے۔

زرینہ کے والدین اس سے بڑی محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ہی اسے شادی کے موقع پر منع کرنے کے باوجود تحفے میں کار دی تھی کہ اس کا کام بھاگ دوڑ کا ہے۔ کار ضروری ہے اہل کے لیے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ فاروق کام نمٹا چکا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کا غصہ سرد پڑتا جا رہا تھا اور اس کی جگہ احساس جرم نے لے لی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ زرینہ نے جو کچھ کیا اس میں وہ حق بہ جانب تھی۔

اس نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو بمبئی کا نمبر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھاتے ہی اسے زرینہ کی آواز سنائی دی۔ ”زرینہ..... میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں پاگل..... بے وقوف ہوں۔“ اس نے بلا تہمید کہا۔ ”غلطی میری تھی۔ میں شرمندہ ہوں۔ تم تمہیں کو لے کر جلدی سے گھر آ جاؤ۔“

”فاروق..... ہم نے تمہیں بہت یاد کیا۔“ دوسری طرف سے زرینہ کی آواز بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں کبھی واپس نہ آنے کی دھمکی دی۔“

”پاگل..... فون میں نے کیا ہے۔ معذرت کا حق بھی مجھے ہے۔ اب زیادہ اداکاری مت کرو اور ہاں..... تمہیں سے بات کراؤ۔“

”ڈیڈی..... آپ میرے ہاتھ کا خیال رکھتے ہیں نا؟“ یہ تمہیں کی آواز تھی۔ پہلے تو فاروق کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔ پھر اسے وہ بھس بھرا ہاتھ یاد آیا۔ ”ہاں جان..... لیکن وہ تمہارے بغیر اواس ہو گیا ہے۔ تم جلدی سے واپس آ جاؤ۔ اب ریسیور اہل کو دو۔ ہاں زرینہ..... تم کل کی فلائٹ سے آ جاؤ۔ شام کو تمہیں ایئر پورٹ پر ریسیور

کروں گا۔

”فرمت ہوگی تمہیں؟“ زرینہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

فاروق بھی ہنس دیا۔ ”اب تو فرمت ہی فرمت ہے۔“

☆=====☆=====☆

فاروق کو کمرے کے تاریک گوشے میں حرکت کے احساس نے چونکا دیا۔ اس وقت وہ ٹی وی پر ایک اسٹیج شو دیکھ رہا تھا۔ میزبان ایک اداکارہ سے بات کر رہا تھا۔ اس نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر کمرے کے اس گوشے کی طرف دیکھ لیں۔ وہاں ایک عورت کھڑی تھی۔

فاروق کو عجیب سا احساس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے وہ اُڑ رہا ہو۔ وہ عورت سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کی نقوش واضح نہیں تھے۔ اس کا وجود دھند میں لپٹا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ دھند چھٹنے لگی۔ پھر فاروق حیران رہ گیا۔ ”ارے زرینہ..... تم؟“

عورت ساکن و صامت کھڑی اس کے عقب میں کسی غیر مرئی نقطے کو گھورتی رہی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ جیسے چٹخا، منہ یوں کھلا، جیسے وہ چیخنا چاہ رہی ہو۔ ”زرینہ!“ فاروق چلایا۔

عورت نے اسے پیچھے ہٹانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ پھر اچانک وہ فضا میں غلیل ہو گئی۔ فاروق نے اپنی پلکیں جھپکائیں اور پھر آنکھیں سختی سے بھیج لیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ اس نے کئی بار سر جھٹکا۔ شاید گزشتہ روز کی تھکن اس کے ذہن پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

وہ پھرتی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پروگرام کا میزبان اب بھی اداکارہ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ اس کا خواب ضرور چند لمحوں پر محیط تھا کیونکہ اس نے زیادہ گفتگو مس نہیں کی تھی۔ وہ خواب تھا یا فریب نظر؟ وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ شاید اس کے تھکے ہوئے دماغ کا کرشمہ تھا۔ اس نے پھر سر جھٹکا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ابھی ایئرپورٹ جانے میں خاصا وقت تھا۔ اسے وقت گزاری کرنا ہی تھی۔ اس نے سوچا، وقت گزاری ایئرپورٹ پر ہی کر لی جائے گی۔

وہ دہواڑے پر ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ وہ سوچتا رہا کہ فون ریسیو کرے یا نہ

ہے۔ کہیں دفتر سے کوئی اور کام نہ سوچ دیا جائے۔ پھر اس نے سوچا، ممکن ہے، یہ کافون ہو، فلائٹ سے متعلق۔ کیا جتا، اس نے ارادہ بدل دیا ہو۔ یا اس فلائٹ کا ٹکٹ نہ ملا ہو۔ اس نے بڑھ کر ریسیو راٹھایا۔

”فاروق..... تم فوری طور پر آفس پہنچ جاؤ۔“ دوسری طرف سے سیل گپتا کی داز سنائی دی۔ اس کے لمبے میں کشیدگی اور گھبراہٹ تھی۔

”تمہیں معلوم ہے، مجھے زرینہ کو ایئرپورٹ پر ریسیو کرنا ہے۔“ فاروق نے جھنجھلا کر

”دیکھو..... بہت اہم بات ہے۔ فوراً آ جاؤ۔“

”میں ایئرپورٹ سے واپسی پر آ جاؤں گا۔ ٹھیک ہے؟“

”سنو فاروق..... زرینہ جس چہاز پر آ رہی تھی، وہ کریش ہو گیا ہے۔ کوئی مسافر زندہ نہیں بچا۔“

☆=====☆=====☆

لاشیں شناخت کر لی گئی تھیں۔ تدفین کے وقت سخت سردی کے باوجود فاروق کے جسم سے ہینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، منصوبے بنانے کا فائدہ ہی کیا ہے..... محنت کا کیا حاصل؟ قسمت..... اندھی قسمت، ایک لمحے میں سب کچھ برابر کر دیتی ہے..... ہر چیز جھین لیتی ہے اب..... زرینہ اور تمکین کی موت کے بعد زندگی میں کیا رکھا ہے۔ بے معنی زندگی!

دکھ، غصے اور ملال سے اس کا وجود پھٹنے لگا۔ یہ تو زیادتی ہے کہ وہ دونوں اسے اکیلا چھوڑ کر چل دیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اب دکھ برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ قبروں پر گر گیا اور سسکیوں کے درمیان ان دونوں کے نام پکارنے لگا۔

کی کی تسلی..... کوئی دلاسا اس کے غم کا مداوا نہیں کر سکتا تھا۔

☆=====☆=====☆

سرد ہوا اس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ چونک کر جاگا۔ اسے گرد و پیش میں ایک جانی پہچانی خوشبو محسوس ہوئی۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور بالآخر اس خوشبو کو پہچان لیا۔ وہ کافور کی بو تھی۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں سی ریگنے لگیں۔ پھر اسے جانی پہچانی آہٹ سنائی دی..... سینڈل والے پیروں کی چاپ..... پھر بیڈ کی پائنتی کی طرف

ہاٹک زرینہ نمودار ہوئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے، مگر اس کے باوجود وہ اسے گھورتا رہا۔ وہ اس کے وجود سے متعلق تمام جزئیات ذہن نشین کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود کو یاد دلائے جا رہا تھا کہ یہ خواب ہے..... محض خواب، اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ بے حد کوشش کے بعد وہ بستر سے اٹھا اور ہاتھ روم جا کر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ بے خوابی کی تمام علامات اس کے چہرے پر موجود تھیں۔ تھلائی کے مہیب احساس نے اس کے پورے وجود کو جکڑ لیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے میں آیا اور لائٹ آن کر دی۔ پھر وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے دل میں شدید خواہش ابھری کہ کاش وہ بھی زرینہ اور تمکین کے ساتھ مر گیا ہوتا۔ اب اس کے پاس بھی رہا ہوا ہے۔ خلی گھر بے معنی روزگار اور تھلائی!

اس کا جی چاہا کہ ریزر سے اپنی کلاسیاں کاٹ لے۔ وہ دل ہی دل میں رفقے کا مضمون مرتب کرنے لگا۔ ڈیئر زرینہ اور تمکین۔ جتنی محبت میں تم سے کرتا ہوں، اس کے بعد تمہارے بغیر زندگی میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ تم جہاں کیس بھی ہو، میں بست جلد تم سے آلوں گا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ سرگوشی میں ان دونوں کو پکارتا رہا تھا۔ دیر تک وہ سسکتا رہا۔ پھر اس نے سر کو جنبش دی چلو، اچھا ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اس نے سوچا۔ کل میں ان دونوں کی چیزیں ویلفیئر والوں کو دے دوں گا۔ وہ دونوں بھی یہی چاہتی ہوں گی کہ میں انہیں بھول جاؤں۔ میں مکان بیچ دوں گا اور ایک چھوٹا سا پارٹمنٹ لے لوں گا اور کام میں مصروف ہو جاؤں گا۔

☆=====☆=====☆

صبح دھوپ اس کے کمرے میں در آئی تو اس کی آنکھ کھلی۔ اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ چار بج کر بارہ منٹ ہوئے تھے۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آن کیا۔ کیونکہ وہ خبروں کا وقت تھا لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی دیر سو سکتا ہے۔ ”صبح کے آٹھ بجے ہیں۔ اب آپ خبریں سنئے۔“ ریڈیو نے اسے حیران کر دیا۔

وہ اچھل کر بستر سے اتر۔ اسے کام پر جانا تھا۔ اسے نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ سب سے پہلے اسے زرینہ اور تمکین کی وہ چیزیں الگ کرنا تھیں۔ جنہیں ویلفیئر والوں کو دینا تھا۔ وہ کچن کی طرف آیا۔ پھر وہ بری طرح چونکا۔ اس نے پورے گھر کا جائزہ

لے لیا۔ گھر میں موجود ہر گھڑی چار بج کر بارہ منٹ پر رکی ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر نکل آئے گا۔ پھر اسے جھٹکا لگا۔ زرینہ کا جہاز چار بج کر بارہ منٹ پر حادثے کا شکار ہوا تھا۔ وہ قریب پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر بیڈ روم میں آہٹ ہوئی۔ وہ دیوانہ وار لپکا۔ بیڈ روم میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک ایک کمرے میں جھانکتا پھرا۔ ایک کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا آئینہ دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر اسے گرنے سے روکا۔ آئینہ پھسلنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا دل پھر بڑی طرح دھڑکنے لگا۔

اس نے چائے بنائی اور چائے کے گھونٹ پیتے ہوئے پیش آنے والے واقعات کی زنجیر کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ممکن ہے، کوئی جیٹ طیارہ گزرا ہو اور اس کے پیڑا کردہ ارتعاش کی وجہ سے آئینہ پھسلا ہو۔ لیکن تمام گھڑیوں کے ایک مخصوص وقت پر بند ہونے کی کیا وجہ ممکن ہے۔ اتفاق؟ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ یہ اس کے دماغ کا کرشمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی مایوسی سے لڑ بھی چکا تھا اور جیت بھی چکا تھا۔ وہ فریب نظر بھی نہیں تھا۔ گھڑیوں کی سوئیاں تو اب بھی وہیں ٹھہری ہوئی تھیں۔

چائے پینے کے بعد اس نے خالی کارٹن اکٹھے کیے اور زرینہ اور تمکین کی چیزیں ان میں رکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران اس نے بڑی مشکل سے ان چیزوں کے حوالے سے خود کو زرینہ اور تمکین کے بارے میں سوچنے سے باز رکھا۔ اس پیکنگ میں آدھا دن گزر گیا۔ تاہم اس نے جذباتی طور سے خود پر قابو رکھا تھا لیکن تمکین کے ہاتھی نے اس کے ضبط کی دیوار گرا ہی دی۔ اسے وہ ہاتھی اگلے قدموں پر بیٹھ کر کھانے کی بھیک مانگتا محسوس ہوا۔ اس کے حلق میں گولا سا پھنس گیا۔ اپنی سسکیوں پر قابو پانا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ اپنی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے ہاتھی کو بھی کارٹن میں ٹھونس دیا۔

وہ بری طرح تھک گیا تھا لیکن یہ سوچ کر کام میں لگا رہا کہ وہ اس وقت ایک رفاہی کام کر رہا تھا۔ یہ چیزیں جانے کتنے مستحق لوگوں کے کام آئیں گی۔ تمام کارٹن پیک کرنے کے بعد اس نے ویلفیئر آفس والوں کو فون کر کے اپنا پتا لکھوایا۔ تاکہ وہ یہ کارٹن

اٹھوالیں۔

اس رات اس نے خوب پی اور پیتے پیتے سو گیا۔ اس بار اسے زریںہ نظر نہ آیا لیکن وہ بار بار چونک کر جاگتا رہا۔ وہ خواب میں تمکین کو سڑکوں پر چلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے آسمان پر ایک سفید سائفل نظر آیا۔ نیچے آنے پر پتا چلا کہ کبوتر ہے۔ نیچے آنے کے بعد کبوتر اس کے گرد چکر لگاتا رہا اور پھر زمین پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ ”ڈیڈی یہ تو گیا۔ مر گیا نا؟“ تمکین نے اس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تمکین کے شانے جھکے۔ ”ڈیڈی..... یہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ کبھی زندہ نہیں ہو گا؟“ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”نہیں بیٹا۔ اس کی روح پرندوں کی جنت میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ پھر اس نے جھک کر کبوتر کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔ کبوتر نہیں..... وہ تو تمکین تھی..... خون میں نہائی ہوئی۔

وہ ہانپتے اور چیختے ہوئے بیدار ہوا۔ جاگنے کے بعد اس نے اپنی جینوں پر قابو پایا چند لمبے خاموش لیٹا رہا۔ پھر اس نے کلاک کو دیکھا۔ صبح کے پانچ بجے تھے۔ اب مناسب نہیں تھا۔ اس نے سوچا، آج کیا کیا جائے۔ آفس جا کر بکھرا ہوا کام سنبھالا جا۔ کوئی نیا کام شروع کیا جائے۔ کوئی نیا فیچر! اس نے نما کر کپڑے بدلے اور کسی ریسٹورنٹ میں ناشتے کا ارادہ کر کے نکل آیا۔ وہ گھر میں کم سے کم وقت گزارنا چاہتا تھا۔

دفتر میں مصروفیت کی وجہ سے کچھ پتا ہی نہ چلا کام ختم ہوا تو گھر جانے کا وقت ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ گھر جلدی گیا تو پینے میں مصروف ہو جائے گا۔ اب اسے تینوں وقت کے گھر سے باہر ہی کھانا تھا۔ اس نے افسردہ ہو کر سوچا، رات کا کھانا ویسے ہی میں کون سا کھانا تھا۔ اب تو گھر میں یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ گھر واپس پہنچا تو لان میں رکھے ہوئے کارشن، جو وہ جاتے ہوئے باہر نکال کر گیا تھا، اٹھائے جا چکے تھے۔ ویلفیئر والوں نے صبح ہی گاڑی بھیج دی ہو گی۔ اس پوسٹ بکس چیک کیا۔ اس میں دو خط موجود تھے۔ ایک بمبئی سے آیا تھا..... زریںہ والدین کی طرف سے، اور دوسرا پیٹر جون کی طرف سے۔ اس نے پیٹر کا خط کھولا۔ پیٹر اس کی بیوی اور بچی کی موت پر دلی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے ملاقات درخواست کی تھی۔ فاروق نے سر جھٹکا۔ پیٹر جون اور ٹام ہنری کے مجوزہ مناظرے کا۔

خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے سوچا، یہ وہ کام ثابت ہو سکتا ہے، جو میری توجہ زریںہ اور تمکین کے غم سے ہٹا سکے گا۔

دونوں خط جیب میں ڈال کر وہ گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں اندھیرا تھا اور غیر فطری خلی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے لائے ہوئے تھیلے میں سے شراب کی بوتل نکالی اور برف کے لیے فریج کی طرف بڑھلا۔ پھر وہ یوں ساکت ہوا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ تمکین کی کرسی پر اس کا بھس والا ہاتھی بیٹھا تھا۔

☆-----☆-----☆

تھی، جو رات اس نے خالی کر دی تھی۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر وہ بیٹھا سانسے والی دیوار کو دیکھتا رہا۔ وہ خواب اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کیا یادوں کا کوئی انت نہیں ہوتا۔

کمرے میں ہلکی روشنی تھی۔ مگر اسے تاریک گوشے میں فرش پر روشنی کا ایک دائرہ تھرکتا نظر آیا۔ چند لمحوں بعد دائرہ کچھ بڑا ہو گیا۔ وہ دیوار تک پہنچا اور اس نے ایک سر اور کندھوں کی شبیہ اختیار کر لی۔ شبیہ کا چہرہ تاریک تھا۔ اس کے باوجود وہ زرینہ کی مماثلت پہچان گیا۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے روشن دائرے کی طرف بڑھا۔ دائرہ متحرک ہوا اور دروازے کے قریب پہنچ کر غائب ہو گیا۔ فاروق خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ اس کے شراب زدہ ذہن کا کرشمہ ہے۔

اس نے دروازہ کھول کر باہر سڑک کی سمت دیکھا۔ روشنی کا دائرہ لان میں تھرک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسے کہیں لے جانا چاہتا ہے۔ فاروق اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ فضا کمر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اوور ہیڈ برج بہت دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ روشن دائرہ برج کی سیڑھیاں پھلانگتا رہا۔ فاروق اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دائرے کی وجہ سے اسے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ دائرہ کمر کے سینے میں کسی روشن شکاف کی طرح تھا۔ فاروق نے اچھل کر دائرے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اگر اس کے ہاتھ میں رینگ کا بالائی حصہ نہ آگیا ہوتا تو وہ نیچے جا گرتا۔ وہ پاؤں جھلاتا برج پر واپس آنے کی کوشش کرتا رہا۔ بڑی جدوجہد کے بعد وہ خود کو رینگ کی محفوظ سمت لانے میں کامیاب ہوا۔

نیچے اتر کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔ زرینہ کی شبیہ والا روشن دائرہ اب غائب ہو چکا تھا۔ وہ گھر کی طرف چل دیا۔ اب وہ خود کو پوری طرح بیدار محسوس کر رہا تھا۔ نشہ بھی پوری طرح اتر چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ زرینہ کی شبیہ نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ اسے اتنی دور لے جانے کا کیا سبب ہو سکتا تھا۔ شاید وہ اسے بھی وہیں بلالینا چاہتی تھی، جہاں وہ اور تمکین تھیں۔ اس نے ان خیالات سے بھٹکارا پانے کے لیے بھاگنا شروع کر دیا۔ مگر اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے بلا ارادہ اپنی سمت تبدیل کر دی ہے۔ وہ تو اس وقت چونکا، جب اس قبرستان کے گیٹ پر پہنچا جہاں زرینہ اور تمکین کو دفن کیا گیا تھا۔

وہ ایک دوسرے کے پہلو میں بنی بڑی اور چھوٹی قبر تک پہنچا۔ قبروں کو دیکھنے کے

فاروق صورت حال سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پانچ منٹ میں وہ تین جام حلق سے اتار چکا تھا۔ اسے خوب یاد تھا کہ اس نے تمکین کے ہاتھی کو کارٹن میں ٹھونس دیا تھا۔ پھر وہ کیسے اندر آیا؟ مگر اس عرصے میں وہ پتا بھی تو رہا تھا لیکن صبح تو اس نے نہیں لی تھی اور صبح ہاتھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ تھک ہار کر اس نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کی یادداشت دھوکا دے رہی ہے۔ یا پھر کوئی اس کے ساتھ کوئی بے رحم کھیل کھیل رہا ہے۔ مگر کون؟ اس نے سوچا، اسے کسی سائیکا ٹرسٹ یا کم از کم ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ مگر یہ بھی نہیں کہ اسے اپنے ہوش و حواس کی سلامتی پر کوئی شک ہو۔

اس نے اب تک جو کچھ دیکھا تھا، اسے ذہن میں ترتیب دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے حادثے کے وقت زرینہ کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اسے وہ ڈکھ کی کارگزاری قرار نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک اسے حادثے کا علم نہیں تھا۔ پھر دوسری بار وہ کافور کی بو کے ساتھ نظر آئی۔ پھر تمام گھڑیاں چار بج کر بارہ منٹ پر بند نظر آئیں۔ اس نے آئینے کو ڈریسنگ ٹیبل پر پھسلے دیکھا جبکہ اس نے کسی جہاز کے گزرنے کی آواز بھی نہیں سنی تھی بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ صبح کے وقت اس طرف سے جہاز کبھی نہیں گزرے تھے۔

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور سختی سے آنکھیں میچھنی لیں۔ اس نے سوچا، پچھلے کچھ عرصے سے وہ روح کے چکر میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ایسے میں اس کا ذہن کوئی بھی کرشمہ دکھا سکتا ہے۔ شروع میں جب اس نے مختلف امراض پر فیچر لکھے تھے۔ تو وہ خود کو ان امراض میں مبتلا محسوس کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے، یہی بات ہو۔ مگر.....

یہ سوچتے سوچتے ہی وہ سو گیا.....

☆=====☆=====☆

بڑا جیٹ طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔ اس نے زمین چھوڑی اور افق کی طرف بلند ہوتا گیا۔ پھر اچانک اس کی آواز ٹکی اور وہ خون اور گوشت کے لوتھڑوں سے نہا گیا۔

فاروق جاگا تو اس کا جسم پسینے میں نہلیا ہوا تھا۔ بیڈ کے نیچے شراب کی وہ بوتل پڑی

ڈالے۔

”خدا جانتا ہے، میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا ہوں ڈاکٹر۔ ان کی موت کے بعد میں نے اور کیا ہی کیا ہے۔“ فاروق نے بے بسی سے کہا۔

ڈاکٹر نے نسخہ لکھ کر اس کی طرف بڑھادیا۔ ”فاروق صاحب آپ ان حقائق کا سامنا کر رہے ہیں، جنہیں قبول کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں۔ ایسے میں دماغ تو کرب دکھائے گا ہی۔ میں آپ کو بتا دوں، آپ تیزی سے نروس بریک ڈاؤن کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں ہر شخص کا یہی حشر ہوگا۔ بہر حال آپ جوان آدمی ہیں۔ انجوائے کیجئے۔ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ میں آپ کو نیند کی گولیاں تجویز کر رہا ہوں۔ ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے ایک اچھی نیند ضروری ہے۔“

فاروق نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ ان دونوں پر تکیہ نہیں کرے گا۔ غم کا سب سے اچھا علاج مصروفیت ہے۔ اب اسے بھاسکر شو کے مناظرے کے لیے کام کرنا تھا۔

☆=====☆=====☆

دلپ بھاسکر کو وہ آئیڈیا بہت پسند آیا۔ وہ اس سلسلے میں کئی فیچر بڑھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ مناظرہ اس کی اور اس کے شو کی مقبولیت میں بے حد اضافہ کر سکتا ہے۔ اس نے فاروق کا شکریہ ادا کیا اور پروگرام کے لیے تاریخ بھی دے دی۔ بھاسکر شولا یو دکھایا جاتا تھا۔

پروگرام شام کو پیش ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ ضروری تھا کہ اگلے روز کی اشاعت کے لیے اس کی جگہ مخصوص کی جائے۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد اس پر فیچر لکھنے میں وقت لگتا۔ جبکہ اخبار کا فیچر والا حصہ رات نو دس بجے چھپنے کے لیے چلا جاتا تھا۔ وہ فیچر فاروق کے لیے حوصلے کا امتحان بھی تھا۔ اسے اس مسئلے پر لکھنا تھا، جو اس کا اپنا مسئلہ بھی تھا اور اندر ہی اندر اسے چالنے ڈال رہا تھا۔ وہ خود ذاتی طور پر موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اب تک روح کے وجود اور انسان کی ابدیت کے سلسلے میں کوئی ثبوت بھی تو پیش نہیں کیا جاسکا تھا۔ مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایسی قوتیں بھی موجود ہیں جن کی انسانی عقل کوئی توجیہ نہیں کر سکتی۔ اس کا اپنا مزاج ایسا تھا کہ وہ جن چیزوں کی وضاحت نہ کر پاتا، انہیں نظر انداز کبھی نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی وہ ایسے واقعات کی نفی کرنے کا قائل تھا۔ بہر حال، اس نے مکان فروخت کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور

بعد وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور بڑی طرح سسکنے لگا، بچوں کی طرح۔ پھر اس نے بکھری ہوئی مٹی کو سمیٹ کر قبر تک پہنچایا، جیسے ہر وہ رخنہ بند کرنے کا خواہاں ہو، جس سے قبر کے سین کے نکلنے کا امکان ہو۔ پھر وہ اٹھا اور اس نے چھوٹی قبر سے خطاب کیا۔ ”تمکین بیٹا..... میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ میں اپنی بیٹی کی قبر دیکھوں گا۔ ہوتا تو یوں ہے کہ چھوٹے بڑوں کی قبروں کو مٹی دیتے ہیں لیکن..... کیا کروں.....“ وہ زریںہ کی قبر کی طرف مڑا۔ ”زریںہ..... مجھے افسوس ہے کہ یہ سب کچھ یوں ہونا تھا۔ کاش..... تم دونوں کی جگہ میں ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں لیکن اگر تم میرا ساتھ چاہتی ہو تو ابھی..... اسی وقت مجھے اپنی دنیا میں لے چلو۔ ورنہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے اذیت نہ دو۔“ اتنا کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور دونوں قبروں کے درمیان بیٹھ کر گویا دونوں کو اپنے پہلوؤں سے لگالیا۔ ”مجھے لے چلو۔ مجھے موت دے دو۔“ اس نے گڑگڑا کر کہا۔

اسے فضا میں اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ پھر ایک آلو چیخا۔

☆=====☆=====☆

”فاروق صاحب! آپ ایک بہت بڑے جذباتی صدمے سے گزر رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مزید پیچیدگی آپ کے احساس جرم کی وجہ سے ہے۔ آپ خود کو اپنی بیوی اور بچی کی موت کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔ ان خوابوں اور نظر فریبیوں کا یہ سبب ہے۔“

”لیکن گھر کی مادی تبدیلیوں کی آپ کیا توجیہ کریں گے؟“ فاروق نے اعتراض کیا۔

وہ ڈاکٹر کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکا تھا۔

ڈاکٹر دیر تک خاموش رہا، جیسے اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہو۔ ”فاروق صاحب، اس صدمے نے آپ کے ذہن پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ آپ خود کو سزا دینے کے لیے خود ہی تبدیلیاں کر رہے ہیں۔ ہاتھی کو آپ نے ہی کارٹن سے نکال کر گھر میں اپنی بچی کی کرسی پر بٹھایا۔ گھڑیاں آپ ہی نے ساکت کیں۔ یہ سب آپ کے لاشعور کا کرشمہ ہے۔ میں آپ کو بتا دوں۔ آپ کو کسی سائیکالٹرسٹ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ آپ صرف حقائق کا سامنا کرنے، انہیں قبول کرنے کی کوشش کیجئے۔ بات یہ بھی ہے کہ آپ کی بیوی اور بیٹی کی لاشیں قابل شناخت نہیں تھیں۔ اسی لیے آپ ان کی موت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہے ہیں۔ اسے قبول کر لیجئے اور اپنے دکھ کو آنسوؤں سے دھو

آفس کے قریب کسی چھوٹے سے اپارٹمنٹ کی تلاش میں تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس مناظرے کے ساتھ ہی وہ از سر نو زندگی شروع کر سکے گا۔

☆=====☆=====☆

مناظرے والے روز ٹی وی کے باہر بڑی تعداد میں لوگ مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ہاتھوں میں پلے کارڈ تھے اور لیوں پر نعرے۔ وہ سب ٹام ہنری نامی دہریے کی مذمت کر رہے تھے۔ ٹام ہنری آیا تو نعرے بازی اور بڑھ گئی۔ مگر ٹام بڑی بے نیازی سے ٹی وی اسٹیشن کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اسٹوڈیو میں خاصی گرمی تھی۔ کیمرے اپنی جگہ سیٹ تھے۔ کیمرا مین جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ پروگرام پروڈیو سر ہدایات دیتا پھر رہا تھا۔ لائیو پروگرام بڑی ذمہ داری ہوتا ہے۔

اسٹوڈیو ہال نما تھا۔ اس میں خاصی تعداد میں مہمان سما سکتے تھے۔ فاروق سامنے والی قطار میں بیٹھا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور مسکرا دیا۔ ہال بیک ہو چکا تھا۔ اسی قطار میں پادری جوزف گل بھی موجود تھا۔

دلیپ بھاسکر بوتھ سے نکلا۔ اس نے حاضرین کی تالیوں کے جواب میں ہاتھ لہرایا۔ اسی وقت ٹام ہنری، فاروق کی طرف بڑھا۔ ”ایک بری خبر ہے۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے کسی نے فون پر کہا کہ مجھے مذہب کے خلاف بولنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو رات نو بجے اسی اسٹوڈیو میں بم کا دھماکہ ہو گا۔“

”تم نے پولیس کو مطلع تو نہیں کیا؟“ فاروق نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔ ٹام نے نفی میں سر ہلایا۔ فاروق چند لمحے سوچتا رہا۔ پولیس کی مداخلت کی صورت میں پروگرام میں تاخیر ہوگی۔ وہ پورا اسٹوڈیو چھان ماریں گے، کچھ عجب نہیں کہ شوملتوی ہی ہو جائے۔ یوں دوسرے اخبارات کو موقع مل جائے گا۔ وہ اپنی فوجیت گنوا بیٹھے گا۔ اس نے ٹام سے کہا۔ ”پولیس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ایسی دھمکیاں تو لوگ دیتے ہی رہتے ہیں۔“

ٹام ہنری نے کندھے جھٹک دیئے اور اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔ پیٹر جون پہلے ہی اسٹیج پر پہنچ چک تھا۔

ٹام ہنری، پیٹر جون اور دلیپ بھاسکر پروگرام شروع ہونے کا اشارہ ملنے کے منتظر تھے۔ پھر پروڈیو سر نے انگلی اٹھا کر پروگرام شروع ہونے کا اشارہ دیا۔ دلیپ بھاسکر نے

حاضرین سے اپنے دونوں مہمانوں کا تعارف کرایا، موضوع کا پس منظر بتایا اور مناظرے کے ضابطے سمجھائے۔ ”دونوں حضرات کو پانچ پانچ منٹ دیئے جائیں گے۔ جوابی دلائل کے لیے مزید دو منٹ دیئے جائیں گے۔ پھر سوالوں کا وقفہ ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ ٹام ہنری کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اب ہم پروگرام شروع کرتے ہیں۔“

ٹام ہنری آگے جھک آیا۔ اس نے پٹی والا ہاتھ آگے بڑھالیا تاکہ نمایاں رہے۔ فاروق حیران ہوا کیونکہ پٹی پہلے کے مقابلے میں زیادہ بڑی ہو گئی تھی۔ شاید اس طرح ٹام لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ پہلے مسٹر پیٹر جون کو موقع دیا جائے۔“ ٹام ہنری نے کہا۔ ”دلائل انھیں دینے دیجئے۔ میں انھیں غیر موثر ثابت کروں گا۔“

حاضرین نے پیٹر جون کی حوصلہ افزائی کے لیے بے حد گرم جوشی سے تالیاں بجائیں۔ پیٹر جون نے تشکر کے طور پر ہاتھ لہرایا۔ خاموشی ہونے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ ”انسان کے لیے اہم ترین سوال یہ ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا انسان کو مرنے کے بعد زندگی ملتی ہے؟ آغاز تاریخ کے زمانے ہی سے یہ شواہد ملتے ہیں کہ انسان کو یقین تھا کہ قبر انسانی شخصیت کا خاتمہ نہیں کرتی.....“

”مجھے اعتراض ہے۔“ ٹام ہنری نے چیخ کر کہا۔ ”ایسی کوئی شہادت موجود نہیں کہ آدمی موت کے بعد پھر زندہ ہوتا ہے۔“

دلیپ بھاسکر زروس نظر آنے لگا۔ پھر اس نے ٹام سے کہا۔ ”پلیز..... توجہ سے سنیں۔ مسٹر پیٹر نے یہ نہیں کہا۔“

”تو کیا کہا ہے انھوں نے؟“

دلیپ بھاسکر چند لمحے سوچتا رہا، پھر پیٹر کی طرف مڑا۔ ”آپ نے کیا کہا تھا جناب؟“

”میں نے کہا تھا، میرے خیال میں اس امر کی شہادتیں موجود ہیں کہ انسان بہت پہلے سے حیات بعد الموت پر یقین رکھتا ہے۔“

”ہاں..... یہ بیان کچھ بہتر ہے۔“ ٹام نے تنبیہی انداز میں کہا۔

”بہتر کا کیا مطلب؟ میں نے تو پہلے بھی یہی کہا تھا۔“

”پلیز..... آپ لوگ اس طرح نہ اُبھیں۔“ دلیپ بھاسکر نے مداخلت کی۔

”تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ زمانہ قدیم کا انسان بھی موت کے بعد کی زندگی کے خیال کا

اسیر تھا۔ "پیٹر جون نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "آج بھی کروڑوں انسان روح اور اس کی دائمی بقا پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم روحانیت پرست یقین رکھتے ہیں کہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والی ناقابل توجیہ باتیں حیات بعد الموت کا ثبوت ہیں۔ ہمارے خیال میں موت ایک بندگلی نہیں خوشیوں کا راستہ ہے، جس پر چل کر ہم مسیح اور خدا تک پہنچتے ہیں۔"

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ فاروق نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ فاروق جانتا تھا کہ دھماکا کتنا ہی ہلکا ہو، ہال میں ہونے والی بھگڑ ملک ثابت ہوگی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بیٹھنے لگے۔ باہر نکل جاؤ۔ یہاں ہم بھٹنے والا ہے لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پایا۔ ٹام ہنری کی بلند آواز اور برہم لہجے نے اسے چونکا دیا۔ "سوال یہ ہے کہ انسان روح رکھتا ہے یا نہیں؟ پھر اس سوال کے عقب سے ایک اور سوال جھانکتا ہے۔ کیا خدا موجود ہے؟ میں دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دیتا ہوں۔ تاہم میں اپنے دلائل صرف عقیدہ ابدیت کی نفی کے سلسلے میں دوں گا۔ روحانیت پسندی جب اور جس شکل میں بھی ابھری ہے، سائنس نے اسے رد کیا ہے۔ روحانیت پرستی تھکے ہوئے مایوس لوگوں کے لیے آخری علاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر درحقیقت علاج نہیں ہے۔ اس کے ماننے والے موت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مردے کو مردہ نہیں مانتے۔ مسٹر پیٹر جون نے کہا کہ انسان بہت پہلے سے شاندار اور ابدی مستقبل پر یقین رکھتا آیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو انسان موت سے کیوں خوف زدہ رہا ہے؟ اس کے جسم کو بڑھاپے کی..... یا کسی مملکت مرض کی دیمک چاٹ جاتی ہے، تب بھی وہ زندگی سے کیوں چٹا رہنا چاہتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اس کیوں کا جواب دیتا ہوں۔ اس لیے کہ وہ درحقیقت ابدی زندگی پر یقین نہیں رکھتا۔ وہ صرف اس کی امید رکھتا ہے جب بھی سائنس نے حیات بعد الموت کے سلسلے میں کوئی تحقیقی قدم اٹھایا، روحانیت پسندوں نے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے، اس لیے کہ اپنے اندر..... بہت اندر گہرائی میں وہ جانتے ہیں کہ یہ بے بنیاد عقیدہ ہے۔"

دلپ بھاسکر نے پاکٹ وچ دیکھتے ہوئے وقت ختم ہونے کا اشارہ کیا۔ اب پیٹر جون کی باری تھی۔ پیٹر بری طرح کھانس رہا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "آپ غلطی پر ہیں مسز ٹام ہنری۔ ہم نے تو حیات بعد الموت کی تحقیق کے سلسلے میں ہمیشہ سائنس کی پشت پناہی کی اس کے ساتھ تعاون کیا۔ یہ سوچنا بھی ممکن نظر نہیں آتا کہ زندگی کو موت

ختم کر سکتی ہے۔ زندگی ایک مقدس شعلہ ہے، توانائی ہے، وہ یقیناً نہیں اور نمودار ہوگا۔ آپ انکار کر سکتے ہیں اس سائنسی حقیقت سے کہ توانائی کو فنا نہیں، وہ محض روپ بدلتی رہتی ہے اور اس توانائی کو جو ذہن میں، جسم میں ہوتی ہے، ہم روح کہتے ہیں۔"

ہنری نے قہقہہ لگایا۔ "ان بیمار دلائل سے کام نہیں چلے گا۔ یہ سچ ہے کہ توانائی کبھی فنا نہیں ہوتی لیکن مسٹر پیٹر جون بھول رہے ہیں کہ توانائی اپنی شکلیں یکسر تبدیل کر لیتی ہے اور میں اسے روح نہیں سمجھ سکتا۔ اب مسٹر پیٹر سے..... اور حاضرین سے پوچھتا ہوں۔ آپ میں سے کسی نے کبھی روح کو دیکھا ہے؟"

خاموشی چھا گئی۔ پھر اس میں قہقے اور توہین آمیز نعرے ابھرے۔ پیٹر جون کی آنکھوں سے غیر معمولی چمک ابھری۔ "مسٹر ہنری یا کوئی اور یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ روح نہیں ہوتی اور روحوں اور آسب کے ان گنت واقعات....."

"اب یہ بھوت پریت کی باتیں کریں گے....." ٹام ہنری نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

پیٹر جون نے اپنی پیشانی اور بھووں سے پسینہ پونچھا۔ وہ یوں آگے کو جھکا جیسے کوئی اہم بات کہنے والا ہو۔ اس کا چہرہ یوں چٹ رہا تھا جیسے کسی اترے ہوئے آئینے کا عکس۔

"یہاں گرمی بہت ہے، کوئی کھڑکی نہیں کھولی جاسکتی؟"

دلپ بھاسکر کیرا مین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پروگرام آن ایر ہے۔ وہ حاضرین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند لمحے سکوت رہا۔ کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ پھر حاضرین میں سے ایک شخص..... اور اس کی پیروی کرتے ہوئے کئی افراد اٹھے۔ انھوں نے کھڑکیاں کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیاب کوئی بھی نہیں ہوا۔ "یہ نہیں کھل سکتیں۔" ایک نے کہا۔ اس کا چہرہ زور لگانے کی وجہ سے تھمرا رہا تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بولنے کے احساس نے اسے زور بھی کر دیا تھا۔

اس مداخلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فاروق نے کلاک کی طرف دیکھا۔ پونے نو بجے تھے۔ اس نے ہم بھٹنے کا تصور کیا۔ دیواروں میں سوراخ ہو گئے تھے، جن سے سرد ہوا اندر آگئی تھی۔ ہر طرف گوشت، خون اور ہڈیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ جابجا کائے ہوئے اعضا بکھرے ہوئے تھے۔ چیخیں اور سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد اس خاموشی کو سائرن کی آوازوں نے توڑا۔

موجود تو تھی۔ یہ الگ بات کہ ہم اس سے بے خبر تھے..... اسے دیکھتے نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ.....

”آپ کا وقت ختم ہو گیا۔“ دیپ بھاسکر نے اسے ٹوکا۔
 ”لیکن ابھی میں اپنی بات واضح نہیں کر سکا ہوں۔“ ٹام ہنری نے احتجاج کیا۔
 ”مجھے افسوس ہے۔ اس پروگرام میں ضابطوں کی بڑی اہمیت ہے۔“ دیپ بھاسکر نے کہ اور پیٹر جون سے بولا۔ ”اب آپ کی باری ہے۔“
 لیکن ٹام ہنری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مسٹر پیٹر نے جن سائنسی تجربات کا حوالہ دیا ہے، ان میں سے بیشتر فراڈ ثابت ہوئے۔ آج دنیا کا کوئی نامور..... معقول اور حقیقی سائنس داں.....“

”آپ کا وقت ہو چکا۔“ دیپ بھاسکر نے اس کی بات کاٹ دی۔ حاضرین بھی ٹام ہنری کو ہوٹ کر رہے تھے۔ ”اب حاضرین سوال کر سکتے ہیں۔“
 پیٹر جون اب اکھڑی اکھڑی سانس لے رہا تھا۔ ایک نوجوان نے اس سے پوچھا۔
 ”بارہا ایسا ہو چکا ہے کہ ایک شخص کو مردہ قرار دے دیا گیا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد وہ پھر جی اٹھا۔ تو کیا آپ کے خیال میں روح جسم سے جدا ہونے کے بعد دوبارہ بھی جسم میں واپس آ سکتی ہے؟“

فاروق نے دیکھا۔ پادری جوزف گل اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔ وہ پیٹر جون کی بگڑتی ہوئی حالت کی طرف سے فکر مند تھا۔ ”اس سوال کا جواب دینے کی اجازت چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اسی وجہ سے تو ہم موت اور تدفین کے درمیان مناسب وقفہ چاہتے ہیں تاکہ یقین ہو جائے کہ روح ہمیشہ کے لیے جسم سے جدا ہو چکی ہے۔ سائنس کی بات مختلف انداز میں کہتی ہے۔ جسم میں زندہ ہونے والی تبدیلیاں ظاہر کرتی ہیں کہ روح جسم کو چھوڑ رہی ہے۔ آپ کسی مرتے ہوئے آدمی کو..... اس کے جسم کو دیکھیں۔ اس کی شخصیت، اس کا جسم کیسے تبدیل ہوتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ جسم سے روح کا لباس دھیرے دھیرے اتر رہا ہے۔“

”اس پر کوئی تبصرہ مسٹر ہنری؟“ دیپ بھاسکر، ٹام ہنری سے مخاطب ہوا۔
 ”جی ہاں۔ یہ اس طرح تدفین کا کام کرنے والے اداروں کے لیے لوگوں کو انتظار کے بہانے لٹے کا عذر فراہم کر رہے ہیں۔“ ٹام ہنری نے کہا۔

اب پہلی بار اسے خیال آیا کہ ٹھیک نوبے کا مطلب ٹام ہی ہو سکتا ہے اور کلاک کے اندر ٹام، ہم نصب کرنا کتنا آسان ہے لیکن فون کر کے یہ بتانا کہ نوبے ہم پھٹے گا، اسے بے حد غیر حقیقی اور غیر منطقی لگا۔ اس طرح تو اس نے ہم تلاش کر کے ناکارہ بنانے کا موقع فراہم کیا تھا لیکن غیر متوازن ذہن تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اسے منطق سے کیا غرض.....؟
 پیٹر نے کھڑکیل کھولنے کی کوشش کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور سلسلہ کلام جوڑا۔ ”آسیب ایک ایسا معما ہے، جسے انسان آج تک حل نہیں کر سکا۔ اسی لیے اس سے خوف زدہ رہتا ہے۔ جہاں کہیں کوئی تشددانہ موت واقع ہوئی، وہاں آسیب ضرور ہوتا ہے۔“

دیپ بھاسکر نے سر کی جنبش سے ٹام ہنری کو بولنے کا اشارہ کیا۔
 ”اس دلیل کی رو سے تو ساٹھ لاکھ یودیوں کی روحوں کو ابھی تک نازیوں سے نبرد آزما ہونا چاہیے۔“ ٹام نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
 پیٹر جون نے جگ سے گلاس میں پانی اٹھایا اور غٹاٹ پی گیا۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ”اس سلسلے میں روحانیت پر کام کرنے والے محققین بہت کچھ لکھ اور کہہ چکے ہیں۔ اسپتالوں اور قتل گاہوں میں آسیب کم ہی دیکھے گئے ہیں۔ اجتماعی قتل اور عام اموات میں یہ بات ہوتی۔ فرد فرد کو قتل کرتا ہے تو وہاں آسیب کا چکر چلتا ہے۔“
 ”یہ کہاں کی ہانک رہے ہو تم؟“ ٹام ہنری جھنجھلا گیا۔ ”اس گفتگو کا کیا فائدہ؟ اب تم حضرات کا حوالہ دو گے۔ یہ سب فلکشن ہے۔ قائل کرنے کے لیے منطقی گفتگو کی ضرورت ہے۔“

اس بار پیٹر جون کی آواز میں اضطراب تھا۔ ”ہمارے پاس شہادتیں موجود ہیں جو بڑے سے بڑے بے یقین کو قائل کر سکتی ہیں۔“ اس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ”اس سلسلے میں سائنسی تجربات کیے جا رہے ہیں۔ ای ایس پی، ٹیلی پیٹھی اور ایسے ہی دوسرے علوم سے کیا روح کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔“

حاضرین کی تالیوں سے ٹام ہنری کے چہرے پر بد مزگی کا تاثر ابھرا۔ ”میں ان نام نہاد تجربات کے بارے میں جانتا ہوں۔ ای ایس پی اور ٹیلی پیٹھی کا سبب پیرا نارمل اعصابی توانائی ہے جس کے بارے میں ہم فی الوقت بہت کم جانتے ہیں لیکن اسے بھوتوں سے منسوب کرنا جمالت ہے۔ پچاس سال پہلے ہم بجلی کے بارے میں نہیں جانتے تھے لیکن بجلی

اس پر حاضرین نے احتجاجی شور مچایا۔ دوبارہ خاموشی ہوئی تو پیٹر جون گویا ہوا۔ ”مسٹر ٹام ہنری، تم لالچی اور بد معاش ہو۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتا ہوا سٹیج کے درمیان تک آیا۔ وہاں پہنچ کر وہ رک۔ اس کی ٹانگوں کی لرزش بے حد نمایاں تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ یوں آگے بڑھائے، جیسے سمندر کی پھری ہوئی موجوں کو بڑھنے سے روک رہا ہو۔ پھر اس نے سر جھکاتے ہوئے گونج دار آواز میں کہا۔ ”میں حیات بعد الموت کے سلسلے میں وہ ثبوت کر رہا ہوں جسے مسٹر ٹام ہنری، تم سمیت کوئی دہریہ بھی نہیں جھٹلا سکے گا۔ سنو..... میں.....“

اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکا اور اسٹیج پر ڈھیر ہو گیا۔

بیشتر حاضرین کے حلق سے بیک وقت ہلکی سی چیخیں نکلیں۔ پھر سب گنگ ہو کر رہ گئے۔ ہال پر سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر لوگ اٹھے۔ ہر شخص اپنے طور پر کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک دوسرے کو ہدایات دی جا رہی تھیں۔ فاروق جلدی سے اسٹیج کی طرف لپکا۔ اس نے پیٹر جون کی نبضیں ٹٹولیں۔ مگر وہاں تو موت کا سناٹا تھا۔

”ایمبولینس منگواؤ۔“ دلپ بھاسکر نے چیخ کر کہا۔ ”حاضرین اور ناظرین! ہمیں افسوس ہے کہ مسٹر پیٹر جون کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی ہے۔ اب پروگرام جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ ان کی طبیعت کے بارے میں آپ کو خبروں کے ذریعے معلوم ہو سکے گا۔ اب ہم آپ کو اسٹوڈیو واپس لے چلتے ہیں۔“

فاروق نے پیٹر کی قبض کے بٹن کھولے اور دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں بھی سکوت تھا۔ پیٹر جون مرچکا تھا۔ اس کا فریہ جسم موت کے بعد بے حد سکڑا، سننا ہوا لگ رہا تھا۔ تاہم زندگی جاتے جاتے آخری لمحوں میں اس کی آنکھوں سے اداسی لے گئی تھی۔ ایک لمحے کو فاروق تھرا کر رہ گیا۔ پھر وہ مجمع کی طرف متوجہ ہوا، جس کے شور سے کان پڑی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ”خاموش۔“ پادری جوزف گل نے بہ آواز بلند پکارا۔ ”خداوند صبح کے سپاہی پیٹر جون کی روح اپنے آخری سفر پر روانہ ہو رہی ہے۔“ اتنا کہنے کے بعد وہ ٹام ہنری کی طرف مڑا۔ ”میرے بھائی..... اب بھی وقت ہے۔ مان جاؤ۔“

فاروق نے کلاک پر نظر ڈالی۔ نونج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ دھماکہ نہیں ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

فاروق اپنے ڈرائنگ روم میں کرسی پر بکھرا ہوا تھا۔ تھکن صرف جسمانی ہی نہیں، فی بھی تھی۔ وہ پچھلے چند گھنٹوں کے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پیٹر جون کی ش ایسولنس میں بجوانے کے بعد وہ ٹی وی اسٹیشن سے نکل کر اپنے دفتر پہنچا تھا۔ تاکہ پورٹ مکمل کر کے اخبار کی رکی ہوئی آخری کاپی بھجوا سکے۔

راستے میں وہ کسی بار میں رکتا چاہ رہا تھا۔ مگر سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ گھر کا آرام سے پکار رہا تھا۔ پینے کا سامان تو گھر پر بھی موجود تھا۔

اب اس وقت بیٹھے بیٹھے اسے ہم کی دھمکی کا خیال آیا۔ اسے خود پر حیرت ہوئی کہ اس نے پولیس کو مطلع نہ کر کے کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ اتنے بہت سے لوگوں کی جان کا ہر مول لینے کا اسے کوئی حق بھی نہیں تھا۔ اگر زرینہ زندہ ہوتی تو اس غیر ذمے دارانہ رکت پر اسے کچا چبا جاتی لیکن وہ تھوڑی مہینہ تھی۔ اس کے وجود میں دکھ کی لہر دوڑ گئی۔ اگر وہ زندہ ہوتی تب بھی وہ یہی کہتا کہ ایک اچھی خبر، ایک زور دار فیچر کے لیے ہر طرح کا خطرہ مول لیا جاسکتا ہے۔ اس نے جام کی پلتی شراب بھی حلق میں انڈیل لی۔ وہ بھی خود رض تھا۔ وہ کوئی کامل انسان نہیں تھا۔ مگر کون ہے کامل انسان؟ دلپ بھاسکر ہی کو لے۔ بظاہر وہ پیٹر جون کی موت پر کس قدر دکھی ہو رہا تھا لیکن اندر ہی اندر خوش تھا کہ اس واقعے سے اسے اور اس کے پروگرام کو کتنی زیادہ پہلی ملے گی۔

پھر فاروق کو ایک اور بات یاد آئی، جو عجیب سی تھی۔ پیٹر جون کے مرنے کے بعد اس نے ٹی وی مانیٹر پر ٹام ہنری کا چہرہ دیکھا۔ اس کے رخسار پر ایک کبھی منڈلا رہی تھی۔ وہ بار بار اسے اڑاتا اور کبھی دوبارہ اس کے رخسار پر آ بیٹھتی۔ وہ کسی طرح اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ کبھیوں کا موسم نہیں تھا۔ ویسے بھی ٹی وی اسٹیشن کے کسی اسٹوڈیو میں کبھی کی موجودگی معمولی بات نہیں تھی۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس نے جاکر دروازہ کھولا۔ دروازے پر پشاکھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سردی سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ٹیب سی چمک تھی۔ فاروق ابھمن زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

”میں نے ٹی وی پر بھاسکر شو دیکھا اور خوف زدہ ہو گئی۔ مجھے عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ ضرور کوئی سنگین گزبڑ ہے۔“ وہ اندر آ گئی۔

کروں۔ میں نے بھی کچھ دیکھا تھا اور جو کچھ دیکھا تھا، وہ حادثے کے وقت دیکھا تھا۔ پتا نہیں، دیکھا بھی تھا یا وہ میرا وہم تھا۔“ اس نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”لیکن میں فریب نظر کو فریب نظری سمجھنے کا قائل ہوں۔“

”بحران میں عسکتی والی آتماؤں کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔“ پشپا نے سر ہلا کر کہا۔ ”جب کوئی بہت پیارا شخص کسی جان لیوا صورت حال سے دوچار ہو تو ایسا ہوتا ہے۔“ پھر اس نے فاروق سے تفصیل پوچھی۔ فاروق نے سب کچھ بتا دیا۔ مگر اسی دوران وہ خود اپنے تجربے کا مذاق اڑاتا رہا۔ اس نے پشپا کو ہاتھی اور گھڑیوں والے واقعات کے متعلق بھی بتایا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتی رہی۔ مگر اس کی نظریں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ فاروق کے خاموش ہونے کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”دیکھو فاروق.....“

زیرینہ تم سے رابطے کی کوشش کر رہی ہے لیکن تم اپنے طور پر اس چکر میں نہ پڑنا۔ یہ بے حد خطرناک کام ہے۔ تمہیں ایک میڈیم کی ضرورت ہے۔“

”خطرناک؟“ فاروق نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔ مگر اس بار اس کا قہقہہ اعتماد کی کمی کی چغلی کھا رہا تھا۔

”تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کس قسم کے خطرات پیش آسکتے ہیں۔ تمہارا واسطہ کسی بدروح سے بھی پڑ سکتا ہے۔ درست رابطہ اسی شخص کے ذریعے ممکن ہے، جو

ملائیک ہو۔“

یہ کام تو تم بھی کر سکتی ہو۔“

پشپا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں..... اب یہ میرے لیے ممکن نہیں۔“

”تو کسی اور سے بات کرو۔“ فاروق نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔ وہ اپنی گھبراہٹ مذاق کے پردے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اس طرح معاوضے میں کچھ رعایت بھی ہو سکے گی اور اب تو میں بھی روح دیکھ چکا ہوں۔ کیوں نہ یہ دھند ہی شروع کر دوں۔ خیر ہوؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے پشپا کو اپنی طرف کھینچا۔

پشپا نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔ ”میں نے کمانا..... مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے۔“

اسی وقت ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔ فاروق بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور انٹرومنٹ کی طرف

فاروق نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”روحیں بے چین ہو رہی ہوں گی اور ان کی وجہ سے تمہیں اپنے دل و دماغ پر بوجھ محسوس ہو رہا ہو گا۔“

پشپا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور موضوع بدل دیا۔ ”میں تمہاری بیوی کی موت کے بعد سے تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔“

”کچھ پیو گی؟“ فاروق نے پوچھا۔

پشپا نے نفی میں سر ہلایا، پھر ادھر ادھر دیکھا اور اچانک کانپنے لگی۔ ”میں محسوس کر رہی ہو.....“ وہ کہتے کہتے رکی۔ ”مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے۔ لہریں تہ ہیں۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

پشپا نے کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں یوں بند کر لیں، جیسے اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہ رہی ہو۔ اس کی بھوئیں تن گئی تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”ہاں..... کسی غیر مرئی وجود کی لہریں بہت تند اور شدید ہیں۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ فاروق چڑ گیا۔

پشپا نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں، جیسے گہری نیند سے بیدار ہو رہی ہو۔ ”چھوڑو اس بات کو۔“ اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ پھر اس نے دوبارہ گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ”جب میں تم سے پہلی بار ملی تھی، میں نے تبھی جان لیا تھا کہ تمہاری بیوی اور بچی فضائی حادثے کا شکار ہوں گی۔“ خاصے توقف کے بعد اس نے کہا۔

فاروق نے زور دار قہقہہ لگایا اور بے رحمی سے بولا۔ ”تم بہت اچھی عورت ہو۔

اگر ایسا ہے تو تمہیں مجھ کو خبردار کر دینا چاہیے تھا۔ میں انہیں جہاز سے آنے ہی نہ دیتا۔ مگر تم مجھے خبردار کیسے کرتیں؟ تمہیں پہلے کچھ نظر نہیں آیا تھا اخبار میں خبر پڑھنے کے بعد تم نے سوچا کہ رعب کیوں نہ جمایا جائے.....“

”جھگڑان کی سوگند میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ پشپا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”لیکن

میں جانتی تھی کہ تم میری بات پر یقین نہیں کرو گے۔ تم تو نئے دور کے انسان ہو۔ صرف عقل اور منطق کی سنتے ہو۔“

فاروق نے دونوں آنکھیں بند کر لیں اور انہیں انگلی سے سسلانے لگا۔ پھر اس نے

آنکھیں کھولیں اور سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس بات پر یقین

بڑھل۔ ”ہیلو۔“ اس نے ریسپور اٹھا کر کہا۔
دوسری طرف سے پادری جوزف گل کی بیجان زدہ آواز آجھری۔ ”مسٹر فاروق‘ میں تم سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔“
”اس وقت تو میں مصروف ہوں۔ یہ ملاقات کل پر نہیں مل سکتی؟“
”ٹھیک ہے۔ کل دس بجے چرچ پہنچ جاؤ؟“
”بات کیا ہے؟“

”پیٹر جون نے روح کا وجود ثابت کرنے کے لیے راہ ہموار کر دی ہے۔ فی الوقت میں جنہیں اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔“
فاروق فون ریسپور کے واپس آیا تو پشپا جاچکی تھی۔ فاروق کو غصہ آنے لگا۔ کیا پاپا سے ملنا میری مقدر میں ہی نہیں ہے؟ اس نے جھنجھلا کر شراب کی بوتل اٹھاتے ہوئے سوچا۔

☆=====☆=====☆

صبح بارش شدید ہو رہی تھی۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ موسم باہر جانے کے لیے سازگار نہیں تھا۔ فاروق نے جلدی جلدی چائے پی اور رین کوٹ اٹھایا۔ جوزف گل سے ملنا ضروری تھا۔ زور دار فجر کے لیے مسالہ مل سکتا تھا۔

وہ کار نکالنے کی غرض سے گیراج میں داخل ہوا۔ اُسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے اندر آنے کے بعد گیراج کا دروازہ خود بخود مقفل ہو گیا۔ کار بغیر کسی دشواری کے اشارت ہو گئی۔ دروازہ مقفل پاکر کار سے نکلا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ اس طرف سے مایوس ہو کر وہ کار کی طرف پلٹا کیونکہ اسے خیال آگیا تھا کہ اس نے کار اشارت کر لی تھی۔ کار میں سے بلبلے اٹھ رہے تھے۔ اس نے کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی لاک ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس نے بے خیالی میں دروازہ لاک تو نہیں کر دیا تھا۔ چابیاں انکیشن میں لگی ہوئی تھیں۔ انجن بدستور مرتعش تھا۔

”لعنت ہو۔“ وہ غرایا۔ اب کیا کیا جائے۔ ڈپٹی کیٹ چابیاں گھر میں موجود تھیں۔ مگر گیراج سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ بلبلے نکلنے کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بڑی طرح کھانے لگا۔ خطرے کا احساس پوری شدت سے ابھر آیا۔ اس نے کار کا شیشہ توڑنے کے لیے کچھ چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دروازے کے قریب ہی ایک سلاح اور کچھ

دوسرے اوزار پڑے تھے۔ پھر اسے خیال آیا کہ شیشہ توڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ بوٹ اٹھا کر انکیشن دائر کھینچنے سے بھی کام چل سکتا ہے۔
یہ سوچ کر وہ کار کے اگلے حصے کی طرف گیا لیکن کار اچانک ہی خود بخود گیر میں پڑ گئی اور آگے بڑھ گئی۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا۔ کار بڑھتی رہی۔ وہ گیراج کے دروازے کے ساتھ دبنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بوٹ پر چڑھنے کی کوشش کی۔ مگر اتنی جگہ ہی نہیں تھی۔ وہ بڑی طرح پھنس چکا تھا۔

کاربن مونو آکسائیڈ پورے گیراج میں بھرتی جا رہی تھی۔ اس کے پاس بہ مشکل ایک دو منٹ کی مہلت تھی۔ اس کی پریشانی انتہا کو پہنچ گئی۔ فضا اتنی زہریلی ہو گئی تھی کہ سانس لینا بھی ذوب ہو گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ پڑے تھے۔ بچت کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے جھک کر لوہے کی سلاح اٹھائی اور اسے جتنا بلند کر سکتا تھا کیا..... اور بوٹ پر کئی بار مارا لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے سلاح پوری قوت سے نہیں ماری جاسکی۔ اس نے سلاح چھوڑی اور دروازے کے پاس پڑا ہوا بھاری ہتھوڑا اٹھالیا۔ ہتھوڑا اٹھا کر اس نے بوٹ پر برسوا ڈالا۔ جلد ہی بوٹ میں سوراخ تک نظر آنے لگے۔ ہتھوڑے کے ہروار پر کار چٹکھاتی محسوس ہوتی تھی۔

فاروق کی سانسیں اکٹھرنے لگیں۔ وہ بڑی طرح تھک چکا تھا۔ سرچکرا رہا تھا۔ اس نے کچھ دیر آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ اس صورت حال میں آرام بھی ایک بھیاں تک مذاق معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف وہ بے ضرر کار جو آٹھ سال سے اس کے پاس تھی، اسے جانی دشمن معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی جان لینے پر ٹٹلی ہوئی تھی۔ اس بار اس نے ہتھوڑا اٹھا کر دروازہ پیٹ ڈالا اور ساتھ ہی ساتھ مدد کے لیے چیخنے لگا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ گیراج کی کھڑکی کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔ شیشہ تو اس کا بھی توڑا جاسکتا تھا۔ مگر اب تو وہ کھڑکی تک پہنچ بھی نہیں سکتا تھا۔

بوٹ بے کار ہو چکا تھا۔ اس نے بوٹ اٹھالیا۔ کار کے اہم ترین حصے اب تک کام کر رہے تھے۔ وہ زہر اگلنے والے جانور کی طرح زہریلے بلبلے خارج کر رہے تھے۔ اس نے کار بورسٹر پر ہتھوڑا کھینچ کر مارا لیکن ہتھوڑا کار بورسٹر سے اچھٹنے کے بعد کار کے پہلو میں جاگرا۔ اب وہ خود بے ہوشی کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے ہمت کر کے نیچے سے سلاح اٹھائی اور فیول پمپ پر دے ماری۔ کار کا انجن غرایا اور چند جھٹکے لینے کے بعد

خاموش ہو گیا۔ پھر فاروق نے سلاخ کو گیراج کی کھڑکی کی طرف اچھلا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اس نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی ہے حالانکہ سلاخ کھڑکی تک نہیں پہنچی تھی۔

☆=====☆=====☆

دو آدمی اسے سارے کر اٹھا رہے تھے۔ ان میں ایک اس کا پڑوسی بچے تھا۔ ”وہ تو شکر ہے، میں نے تمہاری چیخ سن لی۔ میں اپنے لان میں کام کر رہا تھا۔“ بچے نے کہا۔ ”ہسپتال لے چلو“ دوسرے شخص نے کہا۔ فاروق اسے پہچانتا نہیں تھا۔ ”میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔ وہ دونوں ہچکچاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ فاروق گھر میں آیا۔ اب وہ پادری گل کے پاس جانے سے پہلے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور اپنی اسٹڈی میں آیا تاکہ پادری کو فون کر کے بتا سکے کہ اُسے آنے میں دیر ہو جائے گی۔ اچانک اس کی نظر ٹائپ رائٹر پر پڑی، جس پر کانڈ چڑھا ہوا تھا، جبکہ فاروق کو یاد تھا کہ اس نے آخری بار ٹائپ کرنے کے بعد کانڈ چڑھا ہوا نہیں چھوڑا تھا۔

اس نے کانڈ کھینچ کر نکالا۔ کانڈ پر مختصر سانوٹ ٹائپ ہوا تھا۔ پوری ایک لائن بھی نہیں تھی۔ ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ جس نے بھی وہ نوٹ ٹائپ کیا ہے، وہ ٹائپ کرنا نہیں جانتا۔ لفظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ درمیانی جگہ کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ تمام حروف چھوٹے ٹائپ کیے گئے تھے لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر نوٹ جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ پڑھنے کے بعد فاروق دہل کر رہ گیا تھا..... میں خودکشی کر رہا ہوں۔ کیونکہ بیوی اور بچی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

فاروق نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ نوٹ لے کر پولیس کے پاس نہیں جاسکتا۔ اسے خوف تھا کہ پولیس والے اسے پاگل قرار دیں گے۔ وہ تفتیش کریں گے اور اس کی ڈاکٹر سے ملاقات کا پتا چلائیں گے۔ ڈاکٹر انھیں اپنی تھپوری بتائے گا۔ وہ فرض کر لیں گے کہ اس نے خودکشی کی کوشش کی۔ ثبوت یہ نوٹ قرار پائے گا۔ کیونکہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ کسی نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے اصرار پر وہ یہی نتیجہ نکالیں گے کہ وہ مدد سے پاگل ہو گیا ہے۔

اس نے سوچا، کہیں وہ واقعی آہستہ آہستہ پاگل پن کی طرف تو نہیں بڑھ رہا ہے۔

یا ممکن ہے، نسیان کا عارضہ لاحق ہو گیا ہو اسے۔ اگر وہ نوٹ اس نے ٹائپ نہیں کیا تو اور کس نے کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟ گھر میں تو کوئی آیا بھی نہیں۔ رات پشپا کے جانے کے بعد اس نے ٹائپ رائٹر استعمال کیا تھا لہذا پشپا پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ممکن ہے اس نے خود غیر شعوری طور پر وہ نوٹ ٹائپ کیا ہو اور اسے احساس بھی نہ ہو۔ پھر گیراج میں جو کچھ ہوا، اس میں کون سے عوامل کار فرما تھے؟ اس نے گیراج کے دروازے کی چابی دروازہ کھولنے کے بعد دروازے ہی میں باہر کی سمت لگی رہنے دی تھی۔ دروازہ جھٹکے سے بند ہوا تو جھٹکے کی وجہ سے ڈبل لاک ہو گیا ہو گا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ کار اس نے خود اپنا رٹ کی تھی۔ بے دھیانی میں وہ دروازہ لاک کر کے چلا آیا ہو گا۔ انجن کے ارتعاش کی وجہ سے گیر لگ گیا ہو گا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ مفروضے بے حد بعید از قیاس ہیں۔

وہ تجزیہ کرنے بیٹھ گیا۔ اگر اس کا دماغی توازن بگڑ رہا ہو تو اس صورت میں وہ ان تمام واقعات کو دوسری دنیا سے روحوں کا پیغام سمجھتا لیکن اس نے تو اب تک اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ کہیں زرینہ کی روح پشپا پر اس کے التفات کی وجہ سے برہم تو نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ برہمی کے عالم میں اس نے گیراج میں اسے قتل کرنے کی کوشش کی ہو۔ کیا یہ ممکن ہے؟ پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو اسی انداز میں سوچنے لگا ہے۔ مرنے کے بعد بھلا کوئی کسی کو مار سکتا ہے۔

☆=====☆=====☆

پادری جوزف گل کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ فاروق کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی طرح فاروق بھی پیڑیجون کا احترام کرتا تھا۔ ”اب بتائیے، آپ کیا کہہ رہے تھے؟“ فاروق نے کہا۔

”پیڑیجون روح کے سلسلے میں کوئی ناقابل تردید ثبوت پیش کرنے والا تھا کہ موت نے اس کی زبان بند کر دی۔“ پادری بولا۔ ”بہر حال، وہ جاتے جاتے سائنس دانوں کو اس سلسلے میں کام کرنے اور ثبوت فراہم کرنے کا بھرپور موقع دے گیا ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ وہ بے حد دولت مند آدمی تھا۔“

”ہاں۔ ہر بڑے شہر میں اور کئی چھوٹے شہروں میں اس کا تہ فنی ادارہ کام کر رہا ہے۔“

”اس کے علاوہ بھی اس کی کئی کمپنیاں ہیں۔ مجموعی طور پر کم از کم آٹھ کروڑ کی جائیداد ہے اس کی، اور اس نے اپنی وصیت میں ہر چیز پی آر آئی کے نام چھوڑی ہے۔ سائیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ ڈاکٹر پال ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کا بنیادی مقصد روح کی موجودگی کا ثبوت تلاش کرنا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی اپنی جدید ترین لیبارٹری ہے اور وہاں روح پر سائنٹیفک انداز میں کام ہو رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے، اب تک انھیں کامیابی نہیں ہو سکی ہے۔“ فاروق نے کہا۔ ”آپ کے خیال میں پیٹر جون کی جائیداد ملنے کے بعد کچھ پیش رفت ہو سکے گی؟“

”ہاں۔ اب لیبارٹری کو جدید ترین اور مٹکے آلات سے مزین کیا جاسکے گا۔ ڈاکٹر پال ایک ایسا چیمبر بنا چاہتے ہیں جہاں وہ مرنے والے مریضوں کو رکھیں گے۔ انھیں یقین ہے کہ اس چیمبر میں وہ روح کا سراغ لگا سکیں گے۔“

فاروق کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک ابھری۔ ”اس وصیت کے بارے میں کس کس کو معلوم ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”فی الوقت صرف پیٹر جون کے وکلاء، ڈاکٹر پال، میں اور تم یہ بات جانتے ہیں۔ میں نے تمہیں اس لیے بتایا کہ میرے خیال میں پیٹر جون کی یہی خواہش رہی ہوگی۔“

فاروق چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ ”یہ زور دار خبر ملی ہے مجھے۔ میں پہلے انسٹی ٹیوٹ والوں سے بات کروں گا۔ پھر اس پر کچھ لکھوں گا۔“

جوزف گلی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”انسٹی ٹیوٹ والے بے حد رازداری سے کام لیتے ہیں۔ وہ تم سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ ویسے بھی میں تم سے التجا کروں گا کہ اس سلسلے میں کچھ نہ لکھو۔“ وہ اٹھ کر کمرے میں شلنے لگا۔

”ہاں..... مناسب وقت پر تم لوگوں کو بتا سکتے ہو کہ ہم روحانیت پرست، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے استفادہ کر رہے ہیں۔ ہم قدامت پسند ہرگز نہیں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ مذہبی رہنما اس پر ہمیں برا بھلا کہیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ روح کے اور حیات بعد الموت کے بارے میں تجسس نہیں کرنا چاہیے۔ پھر ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ مسلمان اور کرپچن علما کا عقیدہ ہے کہ انسان موت کے بعد ایک مخصوص عرصے تک محو خواب رہتا ہے۔ پھر اسے ابدی زندگی اور آخری حساب کے لیے اٹھایا جاتا ہے جبکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ موت محض ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن منتقلی کا نام ہے۔“

”میرے خیال میں اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ ارواح برزخ میں ہوتی ہیں اور حشر کے دن انھیں ان کے جسموں کے ساتھ اٹھایا جاتا ہے۔“ فاروق نے کہا۔

”مذہبی رہنماؤں کے درمیان اتنے اختلافات نہیں۔ البتہ روحانیت پرستوں کے درمیان ہیں۔ مثلاً کچھ روحانیت پسند بائبل کی نفی کرتے ہیں۔ کچھ خدا پر یقین نہیں رکھتے کچھ جنت دوزخ کے قائل نہیں لیکن ایک امر پر سب متفق ہیں۔ سب روح کا وجود ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس دنیا میں، لوگ اس دنیا کی فلاح کی خاطر اپنی روحوں کو پاکیزہ رکھیں۔ ہم اپنا نظریہ ثابت کر کے لوگ کو اس امر کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہم مالمعد النفسیاتی تحقیق کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم روح کا وجود ثابت کر دیں گے تمام شکوک مٹا دیں گے اور جانتے ہو، اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ سنگین جرائم اور قتل کم ہو جائیں گے.....“

”اور اگر روح کا وجود ثابت نہ کیا جاسکا تو.....؟“

پادری کے ہونٹ بھیج گئے۔ ”جب ایک چیز ہے تو اس کی موجودگی ثابت بھی ہوگی۔“

☆=====☆=====☆

فاروق چرچ سے نکلا تو الجھن میں تھا۔ وصیت نامے کی کمائی پر کشش تھی لیکن پادری اس کی اشاعت کے خلاف تھا۔ پادری کی بات ماننے کی صورت میں فاروق کو یہ خطرہ مول لینا تھا کہ کوئی حریف اخبار بھی اس خبر کو لے کر اڑ سکتا ہے اور اگر وہ پادری کی بات نہیں مانتا تو اس کے اعتماد سے محروم ہو جائے گا۔ ویسے فیچر بہت زور دار لکھا جاسکتا تھا۔ سرخی ہوتی..... انسانی روح کا سراغ لگانے کی کوششوں کا آغاز۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے مدد لی جا رہی ہے۔ اس کے بعد وہ ان اثرات کا جائزہ لیتا جو روح کی موجودگی ثابت ہونے کی صورت میں افراد اور معاشرے پر مرتب ہوتے۔ اس نے سوچا، پادری کو نظر انداز ہی کیوں نہ کر دیا جائے مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کم از کم ابھی نہیں کر سکتا۔ فی الوقت تو اسے پادری کے توسط سے پی آر آئی میں داخل ہونا تھا۔ ان کے تجربات کی نوعیت اور نتائج کے بارے میں جاننا تھا۔

☆=====☆=====☆

پی آر آئی کا تعلق یونیورسٹی سے تھا۔ ادارے کی بلڈنگ یونیورسٹی کی حدود میں تھی

ڈاکٹر ماتھر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں آپ سے اتفاق نہیں کرتا پروفیسر۔ پریس کی کوریج ہمارے لیے سودمند ثابت ہوگی اور لوگوں کو ذہنی طور پر تیار بھی کر سکے گی۔“

”لیکن قبل از وقت.....“

”نہیں پروفیسر، اس طرح لوگ سائیکلک ریسرچ میں دلچسپی لینے لگیں گے۔ اس طرح ہمیں مالی امداد بھی مل سکتی ہے۔“

ڈاکٹر پال نے تمدیدی انداز میں انگلی اٹھائی۔ ”پبلسٹی ہمارے لیے ضرر رساں ہو سکتی ہے۔ یہ ہے مالی امداد کی قیمت.....“

سادھنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس معاملے میں ماتھر کے ساتھ ہوں۔ چند ماہ پہلے تک ہمارا کام آگے بھی نہیں بڑھا تھا لیکن اب وقت آگیا ہے کہ لوگوں کو ہمارے کام کے متعلق علم ہو جانا چاہیے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ہم رازداری بھی برتیں اور پبلک کی سپورٹ بھی ہمیں مل جائے.....“

ڈاکٹر پال اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں ایک اجنبی کی موجودگی میں تم دونوں سے بحث نہیں کروں گا۔“ اس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

چند لمحے ناگوار خاموشی رہی۔ پھر ڈاکٹر ماتھر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر پال کو اپنی شہرت اور ملک کے سب سے بڑے اعزاز کی فکر ہے جو ہر سائنس داں کو ہوتی ہے۔“

فاروق کو اس کے لہجے میں حسد محسوس ہوا۔ یوں اس کا کام آسان ہو سکتا تھا۔ وہ سادھنا کو دیکھ کر مسکرایا، جو ماتھر کے پیچھے چل دی تھی۔ ”آپ بھی جاری ہیں؟“

”ہاں۔ تاکہ تم ہمارے اس اہم کمرے میں خفیہ راز سمیٹنے کے لیے اکیلے رہ جاؤ۔“

اس پر تینوں ہنس دیے۔ فاروق نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لنچ میرے ساتھ کیجیے۔“

سادھنا نے آمادگی ظاہر کی اور اپنا لیب کوٹ اتار کر اس کے ساتھ ادارے سے نکل آئی۔ فاروق نے حسن اور ذہانت کا اتنا اچھا امتزاج پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ لیب کوٹ سادھنا کے حسن کو بہت کم کر دیتا تھا۔ ”آپ اتنی حسین اور کم عمر ہیں۔ اتنے بڑے مرتبے تک کیسے پہنچ گئیں؟“ فاروق نے سناٹھی لہجے میں پوچھا۔

سادھنا جواب دینے والی تھی۔ مگر پھر منہ بنا کر رہ گئی۔ فاروق نے سوچا۔ کام اتنا

آسان بھی نہیں، جتنا میں نے سمجھا تھا۔ سادھنا ایسی عورت معلوم ہوتی تھی جسے مردوں کی برتری اور مرہبانہ انداز ناپسند تھا۔

”ڈاکٹر پال کی بات کا برا نہ مانئے گا۔“ سادھنا نے کہا۔ ”ان دنوں ان پر بہت بوجھ ہے۔ ہم سب کا یہی حال ہے۔ پیڑیخون نے ہمیں کئی ماہ پہلے بتا دیا تھا کہ وہ ہمیں اسپانسر کریں گے۔ ہم اپنے تجربے کی ابتدائی تیاریوں کے سلسلے میں بے حد مصروف رہے ہیں۔ جو جستجو ہمیں ہے، وہ نئی نہیں انسان کی ازلی خواہش ہے۔ روح کی تلاش..... اس کے بارے میں جاننا۔ حضرات بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے.....“

”مگر اس میں فراڈ بہت ہوتے ہیں۔ معمول.....“

”دیکھو فاروق۔ معمول دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں فراڈ ہونے کی وجہ سے مسترد کر دیا گیا ہے۔ وہ بانسری بجاتے ہوئے، ڈھول پیٹتے، ڈھونگ رچاتے ہیں۔ دوسری قسم ذہنی معمولوں کی ہے۔ وہ ٹرانس میں آجاتے ہیں اور ان کے جسم اور ان کی آواز پر کوئی روح قابض ہو جاتی ہے۔ اس روح کے ذریعے دوسری روحوں سے رابطہ قائم ہوتا ہے۔“

فاروق مسکرایا۔ ”مجھے تو یہ اور بڑا فراڈ معلوم ہوتا ہے۔“

”اس میں بیشتر میڈیم جعلی ہوتے ہیں۔“ سادھنا نے اعتراف کیا۔ ”لیکن ہم انہی میڈیمز کے ذریعے اپنا کام آگے بڑھا سکتے ہیں، بس اصل میڈیم کو پہچاننے کی بات ہے۔ سائنس سپرنارمل اور سائیکلک ریسرچ کے خلاف نہیں۔ بس وہ ثبوت مانگتی ہے لیکن ثبوت حاصل کرنا اتنا آسان نہیں۔ بہر حال سائنس دانوں کو کوئی الزام نہیں دیا جاسکتا۔ وہ بغیر ثبوت کے کسی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ ویسے ابھی تک اس معاملے میں بیشتر سائنس داں غیر جانب دار اور اوپن مائنڈ ڈ ہیں۔ سائنس میں کامیاب تجربے کی تعریف یہ ہے کہ اسے دہرایا جاسکے اور نتائج کی تصدیق و ترتیب ممکن ہو لیکن پیرا سائیکولوجی اور ای ایس پی میں ایسا نہیں ہوتا۔“

فاروق خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”ہمارے تجربات میں یہ دشواری ہے کہ ہم تجربے کو کامیابی سے دہرا نہیں پاتے۔ اگر ارواح موجود ہیں تو وہ ہمیں تنگ کر رہی ہیں۔ ہر تجربے کا نتیجہ مختلف ہوتا ہے۔ یوں جیسے وہ اپنے وجود کا احساس تو دلانا چاہتی ہیں لیکن شک میں بھی مبتلا رکھنا چاہتی ہیں۔“

”واقعی؟“

”نہیں۔ میں غلط کہہ گئی۔ شہادت اور ثبوت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میں تمہیں شہادت دکھا سکتی ہوں۔ سائیکو کینیس کی موجودگی کا۔“

”یہ کیا بلا ہے؟“

”خیال کی قوت محرکہ..... تبدیل ہونے کی قوت، لیکن یہ حرکت یا تبدیلی کیوں اور کیسے رونما ہوتی ہے، یہ ہم نہیں جانتے۔ ویسے یوں تو آواگون کے حق میں بھی شہادتیں موجود ہیں۔ میں تمہیں شہادت دکھانے کے سلسلے میں ڈاکٹر پال سے اجازت لوں گی۔“

”بہت خوب! میں اس رہنمائی پر تمہارا شکر گزار ہوں گا۔“

☆=====☆

اگلے چند ہفتوں کے دوران فاروق نے اپنا مکان بیچ کر دفتر کے قریب ایک چھوٹا فلیٹ لے لیا۔ کار کی مرمت کرائی۔ اس نے فرنیچر بھی نیا خریدا۔ اب نہ اسے کوئی خواب پریشان کرتا تھا نہ کوئی یاد۔ وہ اب خود کو آزاد محسوس کر رہا تھا۔

اس نے کئی بار سادھنا سے نجی طور پر ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مگر سادھنا نے ٹال دیا تھا۔ آخری کوشش کے نتیجے میں سادھنا نے اسے آنسو پونچھنے کی غرض سے انسٹی ٹیوٹ بلا لیا تھا۔ وہ سادھنا کے گریز کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ جبکہ وہ اس میں دلچسپی بھی لے رہی تھی۔ اس عرصے میں پیٹر جون کی وصیت کے مطابق اس کی جائداد اور اثاثے انسٹی ٹیوٹ کو منتقل ہو گئے تھے۔ انڈین ٹائمز میں یہ خبر دوسرے اخبارات سے ایک دن پہلے چھپی تھی۔ اس کے بعد اخبار کی اشاعت میں اضافہ بھی ہوا تھا۔ لوگوں نے بہت زیادہ دلچسپی ظاہر کی تھی۔ اس کے بعد اسے ڈاکٹر ہریش چند کا خط بھی ملا تھا، جس میں اس نے اس سے فوری طور پر ملنے کی درخواست کی تھی۔

وہ ڈاکٹر ہریش سے ملنے گیا۔ ”آؤ فاروق، تم کتنے مصروف ہو گئے ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ اب کبھی تمہاری صورت نہیں دیکھ سکوں گا۔“ ڈاکٹر نے بونے تپاک سے کہا تھا۔ ”تم ڈاکٹر پال کے لیے اتنے مصروف رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ ”مجھے لگتا تھا اب کبھی تم سائنس رپورٹنگ نہیں کرو گے۔ میں تمہیں اس لڑکے کے والدین سے ملوانا چاہتا ہوں، جو مر رہا ہے۔“

”اور تمہارے خیال میں ارواح کی وہ دنیا کہاں ہے؟“

سادھنا ہچکچائی۔ ”میرے لیے یہ کتنا آسان ہے کہ ان کی فریکوئنسی اور ہے لیکن ابھی تک اس کا پتا نہیں چلایا جاسکا ہے۔ ویسے تم اس پر یقین نہیں کرو گے۔“

”یہ تو ہے۔“

”یوں سمجھو کہ تم ایک مخصوص ٹی وی چینل پر ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم سمجھو دوسرے چینل ہیں ہی نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہیں ان کی فریکوئنسی کا علم نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ ہم اس فریکوئنسی کو جاننے کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔“

”ایک بات بتاؤ۔“ فاروق نے ریٹورینٹ میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”تم اکثر لیبارٹری میں دیر تک کام کرتی ہوگی۔ تمہارے شوہر کو اس پر اعتراض نہیں ہوتا؟“

سادھنا رکی۔ اس نے فاروق کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”عام طور پر اجنبی کسی عورت سے اس کی دستیابی کے بارے میں اسی طرح دریافت کرتے ہیں۔ ہے نا؟“

”میں نفسیاتی تجزیے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔“

”اب جو کچھ پوچھنا ہے، ڈائریکٹ پوچھ لو۔“

”تو سمجھ لو کہ میں پوچھ رہا ہوں۔“

”میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ نہ ہی میری کسی سے دوستی ہے۔“

فاروق کو اندازہ ہو گیا کہ اس کی توقعات آسانی سے پوری نہیں ہوں گی۔ سادھنا کوئی ترانوالہ نہیں تھی۔

کھانے کے دوران فاروق نے پوچھا۔ ”سادھنا..... تم روح پر یقین رکھتی ہو؟“

”میں نہیں چاہتی ہوں کہ تم میرے ذاتی نظریات چھاپو۔“ سادھنا بولی۔ ”یہ بات نہیں کہ میں شہرت سے بچتی ہوں اور نہ ہی مجھے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے کی کوئی پرواہ ہے، بات بس اتنی سی ہے کہ.....“

”یہ کہتے کہتے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ”فاروق..... تم روح پر یقین رکھتے ہو؟“

”میں اس سلسلے میں کھلا ذہن لیے پھرتا ہوں۔ تم ثابت کرو، میں یقین کر لوں گا۔“

”میں تمہیں ثبوت دکھا سکتی ہوں۔“

فاروق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کام اس کی توقع سے کہیں آسان ثابت ہو رہا تھا۔

فاروق کو سائنس رپورٹنگ والا طرز برا لگا۔ بہر حال وہ بغیر کچھ کسے ڈاکٹر کے ساتھ چل دیا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر ایک مرد اور عورت بیچ پر بیٹھے تھے۔ مرد کا سر جھکا ہوا تھا۔ عورت کی آنکھیں متورم تھیں۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔

ڈاکٹر ہریش نے فاروق کو ان دونوں سے اپنے دوست کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ پھر وہ بولا۔ ”مسٹر اور مسز ایڈورڈ! آپ کے بیٹے کے سلسلے میں مجھے ابھی تازہ رپورٹ ملی ہے۔ مجھے افسوس ہے لیکن اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔“

عورت یہ سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ نے اس کا دل ایک اور لڑکے کو لگانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ اس صورت میں وہ لڑکا مر جائے گا۔“

عورت کے حلق سے بھیجی بھیجی آواز نکلی۔ ”جی ہاں، میں اجازت نہیں دے سکتی۔“

”آپ سمجھ نہیں رہی ہیں۔ اس طرح آپ کا بیٹا دوسروں کو جینے میں مدد دے سکتا ہے۔“

مرد نے اپنے گریس میں لتھڑے کپڑوں سے اپنے ہاتھوں کا پسینہ پونچھا۔ وہ یقینی طور پر کوئی موٹر مکینک تھا۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔ ”میں تمہیں اپنے بیٹے کو چیرنے پھاڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”دیکھو..... اب وہ اذیت کے ہر مرحلے سے گزر چکا ہے۔ ہر تکلیف سے بے نیاز ہو چکا ہے مرنے کے بعد آدمی کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ.....“

”کوئی..... صاف صاف کہو۔“ عورت نے پاؤں بیچ کر کہا۔

”دیکھیں مسز ایڈورڈ! ایک اور لڑکا میرے زیر علاج ہے۔ اس کا دل خراب ہے۔ دل نہ بدلا گیا تو وہ جلد ہی مر جائے گا۔ اگر آپ اپنے ڈینی کا دل اسے دے دیں تو آپ کا ڈینی اس لڑکے کے روپ میں دوبارہ جی اٹھے گا۔ آپ جو کچھ چاہتی ہیں، اس میں تو دونوں لڑکے مر جائیں گے۔“ سرجن نے انھیں سوچنے کا موقع دینے کے لیے کچھ توقف کیا، پھر بولا۔ ”مجھے احساس ہے کہ یہ بات آپ کے لیے تکلیف دہ ہوگی۔ یہ نہ معاوضہ ہو گا نہ صلہ لیکن میں آپ کو اجازت دینے پر شکریے کے طور پر دس ہزار روپے دوں گا۔“

مرد اور عورت دونوں نے حیرت سے ڈاکٹر کو دیکھا..... اور پھر ایک دوسرے کو۔ بالآخر مرد نے ڈرتے ڈرتے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ اپنی بیوی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے بیوی کے تپور بگڑتے دیکھ کر سر کی جنبش کا رخ تبدیل کر دے گا۔

عورت نے اپنی تھکی ہوئی آنکھیں پھیلا کر شوہر کو دیکھا اور بولی۔ ”کیا تم ڈینی کی روح بیچ دو گے؟“

ڈاکٹر ہریش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ڈینی کی لاش دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکے گا۔“

”نہیں۔“ مرد مٹھیاں جھنجھٹے ہوئے غرایا۔ ”اپنی رقم اپنے پاس رکھو۔“

فاروق حیران رہ گیا۔ وہ اتنے غریب لوگ تھے..... لیکن دس ہزار کی رقم کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ جب کہ ان کا بیٹا یقینی طور پر مرنے والا تھا۔

ڈاکٹر ہریش نے فاروق کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چل دیے۔ ”میں چاہتا تھا کہ انکار اور عدم تعاون کا یہ مظاہرہ تمہیں بھی دکھا دوں۔ میری فیلڈ کے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سب تمہارے آرٹیکلز کی وجہ سے ہے۔ مذہب زدہ لوگ اعضا دینے سے گریز کرنے لگے ہیں۔“

”ایسا لگتا ہے کہ ہر شخص روح پر یقین رکھتا ہے۔“

”کچھ بھی ہو، اس سے زندوں کو نقصان پہنچ رہا ہے اعضاء دینے والوں کی ہمیشہ کی رہی ہے۔ اب یہ کی خوف ناک حد تک بڑھ گئی ہے۔ جبکہ ابھی ریجیکشن کے مسئلے کی وجہ سے زیادہ تجربات کی ضرورت ہے۔ اب کوئی شخص اپنا جسم ریسرچ کے لیے دینے پر آمادہ نہیں۔ اب تو میڈیکل اسٹوڈنٹ کو انٹروی پڑھانا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ یہ سب اسی خرافات کی وجہ سے ہے۔“

”ڈاکٹر پال اسے خرافات نہیں، سائنس قرار دیتا ہے۔“

ڈاکٹر ہریش نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کیسی ستم ظریفی ہے کہ سائنٹیفک ریسرچ کا ایک شعبہ دوسرے شعبے کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ جبکہ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔“ اس نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ”ڈاکٹر پال بہت ذہین بے وقوف ہے۔ میں اور وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ وہ میرے کام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔“ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”یہ جو رجحان اب چلا ہے، چھرت کے مرض کی طرح پھیلتا جائے

گاہ ایک وقت آئے گا، تبدیلی اعضا کے آپریشن کے لیے اعضا ہی نہیں ملیں گے۔“ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ تم نے میرے بارے میں اتنے فچر لکھے لیکن میں نے تمہارا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔ تمہارے فچرز کے نتیجے میں اعضاء کا عطیہ دینے والوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔“

”مجھے خوشی ہے کہ میں میڈیکل سائنس کے کچھ کام آیا۔“ فاروق نے انکسار سے کہا۔

”لیکن فاروق، صرف اتنی مدد کافی نہیں۔“ ڈاکٹر ہریش اپنی میز کی طرف پلٹ آیا۔ ”تبدیلی اعضا پر ایک سمپوزیم ہو رہا ہے۔ مجھے اس میں لیکچر دینے کی دعوت دی گئی ہے لیکن ابھی میرے کیسز کی تعداد کم ہے۔ پھر مجھے اینٹی رینجکشن دواؤں پر بھی کام کرنا ہے۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”تمہارے پاس اہلک کی طاقت ہے۔ میں چاہتا ہوں، تم اسے ہمارے کام کے فروغ کے لیے استعمال کرو تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اعضاء دینے پر رضامند ہوں۔“

فاروق نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تو اسے آپ سائنس رپورٹنگ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر..... میں صحافی ہوں، تمہارا پبلک ریلیشن آفیسر نہیں۔“

”میں نے تمہیں کبھی انٹرویو دینے سے منع نہیں کیا تم میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“

”نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ بددیانتی ہوگی۔“

ڈاکٹر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا.....

☆=====☆=====☆

لیبارٹری بہت بڑی تھی۔ اس میں ایک طرف کمپیوٹر اور ان سے متعلق آلات تھے تو دوسری طرف کیمیکلز۔ سادھنا نے بڑے تپاک سے اسے خوش آمدید کہا۔ پھر اس نے لیبارٹری ٹیکنیشن بلیئر سے اس کا تعارف کرایا۔ دونوں کے درمیان رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ سادھنا، بلیئر کو پہلے ہی فاروق سے متعارف کرا چکی تھی۔

بلیئر نے فاروق کو چند مائیکرو اسکوپ دکھائے۔ ”یہ جدید ترین مائیکرو اسکوپ ہیں..... اور ان سے کھوجنے والے آلات بھی منسلک ہیں۔ ان سے ہم وہ غلطی بھی دیکھ سکتے ہیں جنہیں عام مائیکرو اسکوپ سے نہیں دیکھا جاسکتا۔“

”لیکن اتنے مائیکرو اسکوپس کی کیا ضرورت ہے؟“

بلیئر نے سوالیہ نگاہوں سے سادھنا کو دیکھا۔ سادھنا نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ ”ہم زندہ اور مردہ خلیوں میں فرق تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک ہی شخص کے زندہ اور مردہ خلیوں کا موازنہ کیا جاتا ہے۔“

”تلاش کیا کر رہے ہو تم؟“

بلیئر نے پھر سادھنا کو دیکھا اور سادھنا نے پھر سر ہلایا۔ ”ہم موت کے وقت خلیوں سے رخصت ہونے والی چیز کی تلاش میں ہیں۔“ بلیئر نے جواب دیا۔

”یعنی روح؟“

بلیئر مسکرایا۔ ”کچھ لوگ اسے یہی نام دیتے ہیں۔ یہ محض آغاز ہے، چند ہفتوں کے بعد ہم.....“

”بس کرو۔“ سادھنا نے مخالفت کی۔ ”چلو فاروق، اب ای ایس پی وارڈ میں چلیں۔“

فاروق اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ ”بلیئر.....! چند ہفتوں بعد کیا ہونے والا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ بلیئر خاموش رہا۔ ”بتاؤ نا..... سادھنا نے تمہاری زبان بند کر دی ہے کیا؟“

”چلو فاروق۔“ سادھنا پھر بولی۔

”جب تک میرے سوال کا جواب نہیں ملتا، میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔“

اسی وقت بلیئر نے گھبرا کر ایک ڈاکٹر کی طرف انگلی اٹھی۔ سوئی بُری طرح لرز رہی تھی۔ بلیئر نے پہلے ایک اور پھر دوسرا لیور گھمایا مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ پھر اس نے ایک پینٹل کھول کر تار باہر نکالے اور بڑبڑاتے ہوئے ابھی تاروں کو الگ کرنے لگا۔ ”اب تو ٹھیک ہو جانا چاہیے۔“ اس نے کہا۔ مگر سوئی بدستور ادھر سے ادھر دوڑ لگاتی رہی۔ وہ ہر دباؤ سے آزاد معلوم ہو رہی تھی۔ بلیئر نے بے تابی سے گلاس کا کور کھولا اور سوئی کو ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ چپنی پھیلی کی طرح اس کے ہاتھوں سے پھسلتی رہی۔

”پروفیسر کو بلاؤ۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔“ سادھنا نے کہا۔ پھر فاروق سے مخاطب ہوئی۔ ”آؤ چلیں۔“

”ہوا کیا ہے؟“

”ٹیکنیکل پر اہم ہے۔ تم نہیں سمجھ سکو گے۔“

باہر نکلتے ہی فاروق نے سادھنا کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم نے بلیر کو یہ بتانے سے روک دیا کہ آئندہ چھ ہفتوں میں کیا ہونے والا ہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ ڈائل اور سوئی والا کیا چکر ہے۔ تم اور بلیر اتنے پریشان کیوں ہو رہے تھے؟“

”یہ روحوں کا چکر ہے۔ انھوں نے بلیر کو مشین کھولنے پر مجبور کر دیا۔“ پھر فاروق کے چہرے کا تاثر دیکھ کر بولی۔ ”برامنہ مت بناؤ۔ یہ مشین بھوت پریت کا نہیں، توانائی کی لہروں کا سراغ لگاتی ہے لیکن اب انھوں نے اس مشین کو ناکارہ بنا دیا ہے۔“

”روحوں کو تمھاری مشینوں میں گڑبڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اس کیوں کا جواب تو ہم بھی تلاش کر رہے ہیں۔“

”تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔ وہ بھوت نہیں، توانائی کی کوئی بدلی ہوئی نامعلوم شکل ہوئی، جسے تم لوگ سمجھ نہیں پارہے ہو۔“

”یہ روحوں ہیں اور ان میں سے بعض روحوں تو بڑی تخریب کار ہیں۔“

اب وہ لیبارٹری کے دوسرے حصے میں پہنچ چکے تھے۔ راہداری میں کمرے ہی کمرے تھے۔ سادھنا نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہاں ایک پلنگ پر ایک شخص لیٹا تھا۔ بظاہر وہ سو رہا تھا لیکن اس کی پلکیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

”یہ ہمارا اہم ترین معمول ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ نیند کے دوران اس کی روح جسم سے نکل جاتی ہے۔ ایسے میں یہ جہاں چاہے جاسکتا ہے۔..... خلاؤں میں بھی۔“

سادھنا نے بتایا۔

”یہ محض اس کا دعویٰ ہے نا؟“ فاروق نے پوچھا۔

”یہ ہم پر ثابت بھی کر چکا ہے۔ سونے سے پہلے ہم اسے بتاتے ہیں کہ عمارت کے باہر سفیدے کے درخت پر ایک کانڈ چپکا دیا گیا ہے۔ جس پر کچھ لکھا ہے۔ اکثر اس نے وہ تحریر لفظ بہ لفظ سنا دی ہے۔“

”یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ذہن پڑھ رہا ہو۔“ فاروق نے اعتراف کیا۔

”یہ ڈبل بلائنڈ اسٹڈی ہے۔ فاروق! تحریر کا علم صرف ایک ایسے شخص کو ہوتا ہے جس کا اس تجربے سے کوئی تعلق نہیں۔ جسے یہ معمول جانتا ہی نہیں۔“

”تب تو انیلی جنس والوں کے کام کا آدمی ہے یہ!“

”نہیں، یہ ہمیشہ ہدایت کے مطابق کام نہیں کر سکتا۔ البتہ کبھی کبھی یہ کسی دوسرے ملک بھی ہو آتا ہے۔“

”ناقابل یقین، کاش میں اس پر یقین کر سکتا۔“

سادھنا نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ”یہ ایک ایسا سائیکلک ہے، جو غیر مادی قوتوں کے معاملے میں بے حد حساس ہے۔ یہ ایک معمول ہے جس کا دوسری دنیا سے رابطہ ہے۔“ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے پہلے کہا۔

فاروق کو پشپا کا خیال آگیا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ یہ بیماری صرف عورتوں کو لاحق ہوتی ہے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”پلیز..... ہمیری کے سامنے کوئی ناخوشگوار بات نہ کرنا میں اسے اپ سیٹ نہیں کرنا چاہتی۔ یہ ہمارا اہم ترین معمول ہے۔“

یہ کہہ کر سادھنا نے دروازہ کھولا۔ کمرے میں ایک میز اور چند کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر خوش لباس شخص بیٹھا کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ انھیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہمیری..... یہ میرے صحابی دوست ہیں..... فاروق۔“ سادھنا نے کہا۔ ”میں انھیں قائل کرنا چاہتی ہوں۔ میری خاطر تم ایک سنگٹ دے سکو گے؟“

”ایک منٹ۔“ فاروق نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”آپ کس سے خوف زدہ ہیں مسٹر فاروق؟“ ہمیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں کیوں خوفزدہ ہونے لگا۔ بس میں ان شعبہ باز یوں پر یقین نہیں رکھتا۔“

ہمیری پھر مسکرایا۔ ”نہیں.....“ آپ واقعی خوفزدہ ہیں۔“

فاروق کی آواز بلند ہو گئی۔ ”کیا تم بھی اپنے عمل کے دوران اندھیرا کرتے..... گھنٹیاں بجاتے ہو؟“

”آپ مجھ سے بچنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ آپ کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔ نہیں تو مجھے رابطہ قائم کرنے دیں۔ اچھا..... یہ بتائیں، آپ کی والدہ زندہ ہیں؟“

فاروق نے خالی خالی نظروں سے سادھنا کو دیکھا۔ اس وقت وہ زینہ اور تمکین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ ان سے میرا رابطہ برسوں پہلے ٹوٹ گیا تھا۔“

ہیری نے سر کو تقیبی جنبش دی اور آنکھیں موند لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے کے نقوش بدلے، جھریاں نمودار ہوئیں اور وہ بوڑھا لگنے لگا۔ جسم بھی سکڑا ہوا سا لگنے لگا۔ پھر وہ بولا تو اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔ ”میں یہاں ہوں“ میں تمہارے پاس آگیا ہوں۔ مجھے تمہارے پاس آکر خوشی ہوئی۔“

فاروق تھرا کر رہ گیا۔ اس نے سرگوشی میں سادھنا سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”یہ پر تپ ہے..... ہیری کا لڑکپن کا استاد۔ دوسری دنیا سے ہیری کا رابطہ یہی ہے۔ یہ وہاں مطلوبہ رُوح کو تلاش کرتا اور ان کے لیے ان سے پیغامات لے جاتا اور لاتا ہے۔“ سادھنا نے کہا اور پھر بدلے ہوئے ہیری کی طرف مڑی۔ ”پر تپ.....“

یہاں فاروق صاحب موجود ہیں۔ تم ان کی والدہ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو؟“

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ہیری کے لبوں سے پر تپ کی آواز ابھری۔ ”میرے ساتھ ایک خاتون ہیں۔ وہ پوچھ رہی ہیں..... ننھے کیسے ہو؟“

فاروق کی منھیاں بھینچ گئیں۔ سادھنا نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔ ”یہ بات سمجھ میں آئی ہے..... یا مہمل معلوم ہو رہی ہے۔“

”خاتون کہہ رہی ہیں..... ننھے، میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا“ اس پر شرمندہ ہوں۔ مگر میں مجبور تھی۔“

”خدا کی پناہ!“ فاروق کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ صرف اس کی ماں اسے ننھے کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکلا۔ سادھنا اس کے پیچھے تھی۔ وہ سیڑھیوں تک پہنچا تھا کہ سادھنا اس تک پہنچ گئی۔ ”میں تمہاری والدہ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ انھوں نے تمہیں آداب کیوں نہیں سکھائے۔“

”یہ گھٹیا شعبہ ہے سادھنا۔ میرا جی چاہتا ہے، اس جھوٹے ہیری کا منہ توڑ دوں۔“

فاروق غرایا۔

”جو کچھ اس نے کہا، وہ درست نہیں تھا؟“ سادھنا نے پوچھا۔

”درست تھا، مگر یہ گھٹیا شعبہ ہے۔ میں نے اس سلسلے میں پڑھا ہے کہ جعلی معمول اپنے ہدف کے نیک گراؤنڈ کے متعلق پہلے ہی معلوم کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ ذہن پڑھ لیتے ہیں۔ ہیری نے ٹیلی پتھی کے ذریعے میرے متعلق مجھے سے معلوم کر لیا ہو گا۔“

سادھنا نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”کچھ کیسز میں یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے لیکن میں نے

تو وہ معلومات بھی حاصل ہوتے دیکھی ہیں، جن کا ہدف مرچکا تھا۔ مثلاً ایک بار ہیری نے ایک شخص کے بارے میں بتایا کہ وہ فرانس میں مرچکا ہے۔ بعد میں اس کی تصدیق ہو گئی۔ یقین کرو، ہیری اصلی معمول ہے۔“

فاروق نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ چالاکی سے کام لیتا ہے، وہ آدمی کا صرف ذہن پڑھ سکتا ہے۔“

”ایک تجربہ اور کرلو۔ ممکن ہے، ہیری کوئی ایسی بات بھی بتا سکے، جس سے تم بھی لاعلم ہو۔ ممکن ہے، وہ تمہارے والد تک پہنچ جائے۔“

”وہ میرے ذہن کو پڑھ کر میرے باپ تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ اپنے باپ کے بارے میں تو میں خود بھی کچھ نہیں جانتا۔ کیا پتا، میری ماں بھی نہ جانتی ہو۔ میں پانچ چھ سال کا رہا ہوں گا۔ میری ماں مجھے ایک اسٹور کے سامنے چھوڑ کر..... یہ کہہ کر گئی کہ ننھے، تم یہیں رکو میں ابھی آئی۔ آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد میں اسٹور میں گیا۔ پتا چلا، اسٹور کا ایک دروازہ پیچھے کی طرف بھی کھلتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی ماں کی شکل آج تک نہیں دیکھی۔ میں یتیم خانے میں رہا۔ پھر وہاں سے بھاگ نکلا۔ مزدوری کر کے پڑھتا رہا.....“

سادھنا نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ ”مجھے افسوس ہوا یہ سن کر۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ وہ تکلیف دہ ماضی تو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ بس مجھے یہ سوچنا عجیب لگتا ہے کہ میری ماں مر گئی ہے۔ میں تو ہمیشہ یہ سوچتا تھا کہ کبھی وہ ملے گی..... اور مجھے بتائے گی کہ مجھے کیوں اکیلا چھوڑ گئی تھی اور مجھے ہیری کی بات پر یقین نہیں.....“

”فاروق نے سر جھٹکا۔ ”میں ہیری سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔“

ہیری دوبارہ سنگ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سنگ میں اس کی بڑی توانائی ضائع ہوتی ہے۔ تاہم سادھنا کے بے حد اصرار پر اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔ ایک بار پھر اس کے چہرے کے خدوخال بگڑے۔ پھر پر تپ کی آواز سنائی دی۔ ”میں آگیا ہوں.....“

فاروق نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”یہ بتاؤ، میرے ماموں نے اپنی دولت کہاں دفن کی تھی؟“

سادھنا نے کڑی نظروں سے فاروق کو دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ ہیری کے

”وہ کہہ رہی ہے کہ انگلینڈ سے متعلق کوئی کتاب بک شیفٹ کے اوپری خانے میں رکھی ہے۔ کتاب کا نام انھیں یاد نہیں۔ مگر اتنا ہے کہ وہ سرخ جلد کتاب ہے۔ بانڈز اسی کتاب میں رکھے ہیں وہ کہہ رہی ہیں کہ.....“

اچانک ایک خوف ناک چیخ فضا میں گونجی۔ ہیری یا پرتاپ کی آواز اس میں دب گئی۔ آواز راہداری کی سمت سے آئی تھی۔

ہیری نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے یوں سر جھٹکا جیسے کسی دوا کے زیر اثر سونے کے بعد جاگا ہو۔ فاروق اور سادھنا اٹھ کر باہر لپکے۔ راہداری میں انھیں ڈاکٹر پال، ڈاکٹر ماتھر اور دو نیکینیشن لیبارٹری کی طرف بھاگتے دکھائی دیئے۔ چیخ اب آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔

”بی لیب۔“ ڈاکٹر ماتھر نے چیخ کر کہا۔ پھر اس نے بی لیب کے دروازے کی تاب پر ہاتھ رکھا مگر تیزی سے کھینچ لیا۔ ”ارے..... یہ تو گرم ہو رہا ہے۔“

ڈاکٹر پال نے جیب سے رومال نکال کر اس کی مدد سے تاب گھمائی لیکن دروازہ کھولنے کے لیے اسے خاصا زور لگانا پڑا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر سے دھوئیں کا سیاہ بادل نمودار ہوا۔ ساتھ ہی جلنے کی ناگوار بو۔ دروازے والی دیوار کے ساتھ ایک انسانی وجود لٹکا ہوا تھا اس کے جسم کے تمام کھلے حصے سیاہ پڑ چکے تھے۔ ہاتھ یوں اٹھا ہوا تھا جیسے وہ آخری لمحوں میں دروازہ کھولنے کی غرض سے تاب کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو۔

”یہ..... تو بلیر ہے۔“ ڈاکٹر پال نے سرگوشی میں کہا۔ پھر اس نے نبض محسوس کرنے کے لیے جھلسی ہوئی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جس سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ ”جلدی سے کیرالاؤ۔“ اس نے ایک نیکینیشن سے کہا اور دوسرے کو پولیس کو مطلع کرنے کی ہدایت کی۔

پھر لاش کا ہاتھ نیچے کی طرف جھول گیا۔ کالک سی نیچے گری، جو جلے ہوئے فوسٹ پر بھی ہوتی ہے۔ بو اتنی شدید تھی کہ دم گھٹا جا رہا تھا۔ فاروق کھڑکی کھولنے کے لیے بڑھا۔

”کسی چیز کو مت چھوٹا۔“ ڈاکٹر پال نے لاش پر جھکتے ہوئے کہا۔

لاش کا چہرہ بال سمیت اور جسم کے تمام کھلے ہوئے حصے جل کر کوئلہ ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے کپڑے سلامت تھے اس وقت یہ فاروق کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کپڑوں کے نیچے بدن بھی جل چکا ہو گا۔

ہونٹ کچھ دیر ساکت رہے۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”پرتاپ بابو چلے گئے۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے، فضا رابطے کے لیے سازگار نہیں۔“

فاروق کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ ”تم فراڈ ہو۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”جھوٹے دھوکے باز ہو تم۔“

”میں اس الزام کے جواب میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

سادھنا نے فاروق کا کندھا تھپک کر اس کا غصہ سرد کرنے کی کوشش کی۔ ”خوفزدہ یہ ہے سادھنا۔ یہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں خوف زدہ ہوں لیکن یہ ڈر رہا ہے کہ اس کی پول کھل جائے گی۔“

”یہ بات نہیں۔“ ہیری نے کہا۔ پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے دوبارہ آنکھیں موندیں اور ٹرائس میں چلا گیا۔ ”اس وقت میرے ساتھ جو خاتون ہیں ان کا نام زرینہ ہے۔“ پرتاپ کی آواز ابھری۔ ”وہ تمہیں بتانا چاہتی ہیں کہ وہ اور تم..... ہنکی..... ہاں نیکین..... وہ اور تمکین بغیر کوئی تکلیف اٹھائے اس دنیا سے رخصت ہوئی تھیں۔ اب وہ جس جگہ ہیں وہ بے حد خوبصورت ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ انھوں نے اب آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش ترک کر دی ہے۔ کیونکہ آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو مس کرتی ہیں لیکن یہ بھی جانتی ہیں کہ آپ کبھی نہ کبھی انھیں ملیں گے..... اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

فاروق نے بے دھیانی میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ اس شعبے بازی پر حیران بھی تھا اور الجھ بھی رہا تھا۔ الجھن یہ بھی تھی کہ وہ اس خرافات پر یقین کرنا چاہتا تھا کئی ہفتے سے اسے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا، کوئی غیر معمولی مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اب ہیری یا پرتاپ کی زبانی اسے وجہ معلوم ہو رہی تھی۔ زرینہ نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی۔ یہ بات ہیری کو کیسے معلوم ہوئی؟ خیر..... یہ اتنی بڑی بات بھی نہیں۔

وہ چند لمحوں سوچتا رہا پھر بولا۔ ”زرینہ سے پوچھو، میرے خریدے ہوئے پرائز بانڈ اس نے کہاں رکھے ہیں؟“ یہ بہترین آزمائش تھی۔ کیونکہ بانڈز کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ صرف اور صرف زرینہ ہی جانتی تھی۔

ہیری یا پرتاپ کی خاموشی سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا۔

پہلا نیکینش کیرا لے کر آیا اور اس نے مختلف زاویوں سے جلدی جلدی تصویریں لیں۔ پھر دوسرا نیکینش پولیس اسٹیشن فون کر کے واپس آیا اور نیچے گری ہوئی کالک سمیٹنے لگا۔ اس کا کیمیادی تجزیہ کیا جانا تھا۔ فاروق یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ پولیس کو کرنا تھا، وہ لوگ خود کر رہے تھے۔

”یہ ہوا کیسے؟ کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

سادھنا نے، جو لیبارٹری کا جائزہ لے رہی تھی، جواب دیا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ آسانی سے آگ پکڑنے والے کیمیکل کا کام نہیں۔ کیونکہ یہاں ایسے کیمیکلز موجود ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ بلیئر سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ لہذا ایک اور امکان ختم ہوا۔“

فاروق اس کے پرسکون انداز پر حیران تھا۔ صرف وہی نہیں، پی آر آئی کے تمام لوگوں کا یہی حال تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ اس آگ کی غذا بلیئر کے جسم کی چربی تھی۔“ سادھنا نے مزید کہا۔

ایک نیکینش نے پنسل بلیئر کی لاش میں گزرتی۔ پھر اسے نکال کر بہ نور دیکھا۔

”تمہیں پولیس کو کچھ نہ کچھ تو بتانا ہو گا۔“ ڈاکٹر پال ماتھر نے کہا۔

”کیا مطلب؟ کیا آپ لوگوں کو یہ اعتراف کرتے ہوئے شرم آئے گی کہ آپ کو آگ کا سبب معلوم نہیں؟“ فاروق نے چیختے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

ماتھر نے ڈاکٹر پال کو دیکھا۔ پال نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ گویا اشارہ تھا۔ ماتھر پھر فاروق کی طرف متوجہ ہوا۔ ”آگ کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ اب گرد و پیش کا جائزہ لو۔ یہاں کسی اور چیز پر آتش زنی کا کوئی نشان نہیں۔ دیوار پر بھی نہیں، جس سے بلیئر نکلا تھا۔ اس کرسی پر بھی نہیں، جس پر وہ بیٹھا تھا۔ لگتا ہے، بلیئر کے جسم کے سوا آگ نے کسی چیز کو چھوا ہی نہیں۔“

”اس لیے کہ اس نے ان میں سے کسی چیز کو چھوا ہی نہیں ہو گا۔ ناب کو چھوا تھا تو وہ آپ کو بھی گرم محسوس ہوئی تھی۔“ فاروق نے جواب دیا۔

”تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ اس کے پکڑے صبح سلامت ہیں۔ مگر پکڑوں کے نیچے پورا جسم جل کر کوئلہ بن چکا ہے۔“ ڈاکٹر ماتھر نے انکشاف کیا۔

”کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ!“ فاروق بری طرح گڑبڑا گیا۔ ”ممکن ہے، جسم پر

کوئی کیمیکل لگا ہو۔ سرکس میں آگ کے کھیل میں ایسا کیمیکل استعمال کرتے ہیں۔“

”ایسی کوئی چیز اس لیبارٹری میں موجود نہیں۔“ سادھنا بولی۔

”کیا پتا کیمیکل وہ ساتھ لایا ہو۔“ فاروق کا منطقی ذہن اس غیر منطقی صورت حال سے ہنر آزماتا تھا۔ مگر اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔

سادھنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کچھ بھی ہو، اتنی شدید آگ میں کپڑے بالکل محفوظ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

فاروق نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بجلی کا کوئی چکر بھی ہو سکتا ہے ممکن ہے، ہائی وولٹیج کا شاک لگا ہو۔“

”الیکٹریک شاک کا نشان جسم کے ایک حصے پر ہوتا ہے، پورے جسم پر نہیں اور اس صورت میں اسے چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکتا تھا۔“

ڈاکٹر پال کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے ان کی بحث سے کوئی غرض نہیں۔ اس نے کہا۔ ”عجیب بات یہ ہے کہ آگ ہمارے اندر آنے سے پہلے بجھ گئی۔“

”موضوع بدلنے پر معافی چاہتا ہوں۔ مگر بلیئر کی بیوی کو مطلع کر دینا چاہیے۔“

فاروق نے کہا۔

”یہ کام پولیس کرے گی۔“ ڈاکٹر پال نے کہا۔ اسی وقت دور سے پولیس کار کے سائرن کی آواز سنائی دی۔

فاروق نے ڈاکٹر پال سے پوچھا۔ ”آپ بھی نہیں بتا سکتے کہ آگ کیسے لگی؟“

”مجھے تو یہ خود سوزی کا کیس معلوم ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ نہیں کیا جاسکا کہ

کپڑے جلنے سے کیسے محفوظ رہے۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ روحوں کی حرکت ہے۔“

فاروق نے قہقہہ لگایا۔ ”روحوں کو بلیئر سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“

”جب سے یہ تجربہ شروع ہوا ہے، متعدد عجیب واقعات پیش آچکے ہیں۔ مشینیں

خواہ مخواہ ٹوٹی رہی ہیں۔ مشاہدات کے مسودے غائب ہوتے رہے ہیں۔ ایک نیکینش

نے قسم کھا کر بتایا کہ اس نے ایک بھوت دیکھا تھا۔ وہ اسی دن سے نوکری بھی چھوڑ گیا تھا۔ یہ اور عجیب بات ہے کہ جیسے جیسے تجربات آگے بڑھے ہیں، واقعات پیش آنے کی

رفتار بھی بڑھ گئی ہے۔“

”اب آج ہی کی بات لے لو۔ ایک ڈاکٹر بے قابو ہو گیا تھا۔“ سادھنا نے مداخلت

کی۔

”یہ بھی بھوتوں ہی کی حرکت ہوگی۔“ ڈاکٹر پال نے کہا۔ ”میں متعدد کیسز میں دیکھ چکا ہوں کہ بھوت انسانوں کو ہر طرح کا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔“

”مجھے یہاں سے ڈرا کر بھگانے کے لیے آپ کو کوئی سائنٹیفک بھوت دکھانا ہوگا۔ میں بھوت پریت پر یقین نہیں رکھتا۔“

”مسٹر فاروق، ہمیں تم کو یہاں سے دور رکھنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے پابند نہیں ہیں۔“ ڈاکٹر پال نے سرد لہجے میں کہا۔

”اور آپ کہتے ہیں کہ آپ پبلیٹی سے ڈرتے ہیں۔ تو پھر مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہیں آپ؟“

”تم یہ سب لکھ کر دیکھ لو۔ یقین کوئی نہیں کرے گا۔“

”سوال یہ ہے کہ بھوت یہ حرکتیں کیوں کر رہے ہیں؟ اور آپ اور آپ کا اسٹاف موت کے خطرے کے باوجود اپنا کام کیوں جاری رکھے ہوئے ہے؟“

ڈاکٹر پال مسکرایا۔ ”سپانی جنگ لڑنے جاتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ موت کا قوی امکان موجود ہے۔ اس کے باوجود وہ جنگ میں حصہ لیتا ہے اور اگر ہمیں یقینی طور پر یہ علم ہو کہ ہم میں سے ہر ایک کو بھوت، بلیئر کی طرح ختم کر دیں گے تو ممکن ہے ہم اپنا کام روک دیں۔ لیکن ہم سائنٹیفک ذہن کے لوگوں کو ثبوت کے بغیر کسی بات پر یقین نہیں آتا۔ بلیئر کی موت اور دیگر واقعات کا کوئی اور سبب بھی تو ہو سکتا ہے۔“ اس نے بلیئر کی لاش کو گھورا اور کچھ توقف کے بعد دوبارہ بولا۔

”ہمیں پولیس کو کچھ نہ کچھ بتانا ہی ہوگا۔ ورنہ وہ ہمارے کام میں رخنہ اندازی کریں گے۔ ہم انہیں بتائیں گے کہ بلیئر آگ پکڑنے والے کیمیکلز ملانے کے دوران بے پروائی کا مرتکب ہوا تھا، اس لیے جل مرا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر پال نے کیمیکلز کی الماری کھولی اور ایک کیمیکل فٹب کیل اس نے وہ کیمیکل بلیئر کی لاش پر چھڑک دیا اور دیا سلائی دکھادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاش کے کپڑے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔

”یہ کس لیے؟“ فاروق نے پوچھا۔

”کپڑوں کا نہ جلنا پولیس کو کنفیوز کر دیتا۔ جبکہ اس کا کوئی منطقی جواز نہیں ہے۔ میں نے پولیس کا کام آسان کر دیا ہے۔“ ڈاکٹر پال نے جواب دیا۔

”اس طرح آپ نے پولیس کی تفتیش میں خلل اندازی کی ہے۔“

ڈاکٹر پال نے منہ بنا کر کہا۔ ”تو تم پولیس کو سب کچھ بتادو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

فاروق نے فیصلہ کیا کہ پولیس کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا اور وہ اس قسم کا کوئی مظاہرہ کر کے دکھانے نہیں سکتا۔

☆=====☆=====☆

کیوں ہے کہ ذائل ذالی گزبر و روح کی مداخلت کی وجہ سے تھی۔“
”چھٹی جس کہہ لو۔“

”اور تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ اب تک لیبارٹری میں جو بھی گزبر ہوئی ہے، اس میں کوئی انسانی ہاتھ ملوث نہیں تھا۔ ممکن ہے، یہ ڈاکٹر پال کے کسی حریف کی حرکتیں ہوں۔ کوئی بھی ایسا شخص یہ سب کچھ کر سکتا ہے، جو تم لوگوں کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔“

وہ چند لمحے سوچتی اور چائے کے گھونٹ لیتی رہی۔ ”تم سمجھتے ہو، یہ اندر کے کسی آدمی کی حرکت ہے۔“ اس نے ہونٹ سکڑ کر کہا۔ ”دیکھو..... ہم سب ایک ٹیم کی طرح ہیں۔ ڈاکٹر پال محض اس ٹیم کا ایک رکن ہے۔ اس کی ناکامی ہم سب کی ناکامی ہے۔ باہر سے کوئی گزبر ممکن نہیں۔ ہمارا سیکورٹی نظام ناقابل شکست ہے۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔ ”ایک بات اور۔ سائنس دان ہمارے کام سے چڑتے ہیں لیکن وہ ہمیں نظر انداز کرتے ہیں۔ ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی اور وہیں سے کام آگے بڑھائے گا، جہاں ہم نے چھوڑا ہوگا۔“

”سنو..... تم لوگ اس امر میں دلچسپی لے رہے ہو کہ روح جسم سے کیسے نکلتی ہے۔ تمہارے خیال میں جسم میں داخل کیسے ہوتی ہوگی؟“ فاروق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وضع حمل اور پیدائش کے درمیان کسی مرحلے میں ایسا ہوتا ہے۔ زندگی کے لیے بیج بہت ضروری ہے۔“

”اور جو بیج ادھر ادھر ضائع ہوتے ہیں، کیا ان میں بھی روح ہوتی ہے؟“
”چھوڑو ان باتوں کو کتنے ہی سوال ایسے ہیں، جن کے جواب مجھے بھی درکار ہیں۔“

سادھنا نے کہا۔ ”مجھے اپنی بیوی اور بچی کے بارے میں بتاؤ۔“

”کیا کہوں۔ وہ دونوں بہت اچھی تھیں۔“ فاروق نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”ہم بہت خوش تھے۔ ہم نے مل کر بہت کچھ کیا۔ اب مجھے سب سے زیادہ تکلیف ان

رانسوں سے لڑتے ہوئے ہوتی ہے جن پر ہم ساتھ چلے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آتی

ہیں اور بہت ستاتی ہیں۔ یہ کہنا بہت عجیب لگتا ہے کہ وہ چلی گئیں۔ ابھی چند روز پہلے میرا

یہ جواب سن کر ایک شناسا نے افسروں سے سر ہلاتے ہوئے کہا..... ہاں، آج کل

سادھنا فاروق کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ پولیس کی کارروائی بے حد مختصر تھی اور تفتیشی افسران بے حد مطمئن واپس ہوئے تھے۔ کیونکہ بظاہر کیس میں کوئی بھی پیچیدگی نہیں تھی۔ کسی حادثاتی موت میں بھی نہیں ہوتی۔

فاروق کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال چبھ رہا تھا کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا ہے، قابلِ اشاعت ہے کہ نہیں..... لکھا جائے کہ نہ لکھا جائے؟ ممکنہ طور پر حقیقت یہ تھی کہ بھوتوں نے ایک شخص کو جلا کر مار ڈالا تھا۔ سائنس دانوں نے یہ بات پولیس سے چھپائی تھی لیکن وہ بتاتے بھی تو اس پر کوئی یقین نہ کرتا اور اگر سیل گپتا اس کی رپورٹ شائع کرنے پر رضامند ہو بھی جاتا تو رپورٹ سادھنا، ڈاکٹر پال..... بلکہ انسٹی ٹیوٹ کے لیے بھی نقصان دہ ہوتی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ سادھنا اس سلوک کی ہرگز مستحق نہیں تھی۔

سادھنا اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اس کے ذہن میں بالکل مچ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اسے بانوں بھر لے۔ اس میں کوئی حرج نہیں تھا کیونکہ سادھنا کی نگاہوں میں بلاوے تھے مگر اس کی نگاہوں میں بلیئر کی سوخت لاش پھر گئی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے کھولتے جسم پر بخ بستی پانی ڈل دیا ہو۔

پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے جذبات سرد پڑنے سے بلیئر کی موت کا کوئی تعلق نہیں۔ بلیئر کی موت کو تو وہ شخص عذر کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ درحقیقت زہینہ سے بے وفائی کا خیال اسے پیش قدمی سے روک رہا ہے۔ اس نے زور سے سر جھٹکا۔ زہینہ اب اس دنیا میں نہیں تھی اور کسی کی موت کی وجہ سے انسان فطری تقاضوں سے محروم نہیں ہوتا۔ جو گزر گیا، اسے بھلا دینا ہی عین زندگی ہے..... اور زندگی خود کبھی فطرت سے متصادم بھی نہیں ہوتی۔

”تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو؟“ سادھنا نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”میں روحوں..... بلکہ بھوتوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تمہیں اتنا یقین

”لیکن آپ کے اندازے کی تصدیق پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی کر سکے گی۔“

”میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کو مطلع کرنا ضروری ہے۔“

ماقہرنے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت شکی آدمی ہو۔“

”ذرا ایک نظر کمرے کا حشر دیکھئے۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ یہاں زبردست جدوجہد ہوئی ہے۔“

”دل کے دورے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ مرنے والا بڑی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔“

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔“ ”ماقہرنے کہا۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ”دیکھو.....“

ہمارا تجربہ پہلے ہی دشواریوں سے دوچار ہے۔ مننی پلیٹی بالکل ہی بیڑا غرق کر دے گی۔“

”اگر آپ نے پولیس کو مطلع نہیں کیا تو انڈین ٹائمرز سے آپ کو جو پلیٹی ملے گی، وہ بدترین ہوگی۔“

”تم یہاں صرف چٹ پٹی خبر کے چکر میں آتے ہو۔“ ”ماقہرنے غصے سے کہا۔ ”خیر.....“

اب اس پروجیکٹ کا انچارج میں ہوں۔ میں صاف گوئی سے بتا دوں کہ مجھے اس

فیوری سے اتفاق نہیں کہ بلیئر کو بھوتوں نے ہلا کر مارا تھا۔“ اتنا کہتے ہی اسے شرمندگی

کا احساس ہوا۔ وہ مدافعتاً انداز میں سادھنا سے بولا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ روحانی تحقیق کی

لوہل ہسٹری میں ایسی کوئی نظیر موجود نہیں کہ روحوں نے کسی انسان کو ہلاک کیا ہو۔ وہ تو

کسی کو جسمانی طور پر ذرا سی تکلیف بھی نہیں پہنچا سکتیں۔“

سادھنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”خوف مملکت ثابت ہو سکتا ہے۔ پتھر کے زمانے میں

دگ سورج گرہن دیکھ کر بھی دہشت سے مر جاتے تھے۔“

”لیکن خوف آگ تو نہیں ہوتا۔“ ”ماقہرنے اعتراض کیا۔

”ڈاکٹر“ میں یہ کہنے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مجھے ڈاکٹر پال کی موت غیر فطری معلوم ہوتی

ہے۔ ان کے چہرے کا تاثر..... ان کی آنکھیں دیکھیں آپ نے؟ ان میں مرنے کے

لد بھی ہلا کی دہشت تھی۔“

اس بار فاروق نے سادھنا سے اختلاف کیا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو! تمہارا مطلب

ہے کہ عالم ارواح سے ڈاکٹر پال کو کوئی ڈرانے آیا تھا کہ وہ تجربات سے باز رہیں۔“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتی فاروق۔ پیئر جون کی موت سے عجیب و غریب اتفاقات کا

طلاق بہت ہو رہی ہیں، میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے بتایا کہ وہ کبھی نہ آنے کے لیے گئی ہیں..... اور یہ کہتے ہوئے بڑی اذیت محسوس ہوئی مجھے۔ اب تم بتاؤ اپنے بارے میں۔“

”میری کہانی بہت مختصر ہے۔ شادی کرنے کی فرصت کبھی نہیں ملی۔ محبت بھی کسی

سے نہیں ہوئی تھی۔ اب ہوئی ہے۔“ ”سادھنا نے بڑی سادگی سے کہا۔

فاروق اس بلا واسطہ اظہار پر حیران رہ گیا۔ اس نے سادھنا کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی

تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ سادھنا نے ریسپور اٹھایا۔ کچھ دیر وہ سنتی رہی۔ اس کی آنکھوں

میں آنسو چھلک آئے تھے۔ ”نہیں..... بھگوان نہیں۔ میں ابھی آرہی ہوں۔“ اس

نے چیخ کر کہا اور ریسپور رکھ دیا۔ پھر وہ فاروق سے مخاطب ہوئی۔ ”لیب میں ایک اور

خوف ناک حادثہ ہو گیا ہے۔“ اس کے لہجے میں خوف تھا۔

وہ لیبارٹری میں داخل ہوئے تو انینڈنٹ، ڈاکٹر پال کی لاش پر چادر ڈال رہے تھے۔

ڈاکٹر پال کی پھٹی پھٹی آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی لاش دفتر کے ایک کمرے

میں پڑی ملی تھی۔ اس کی کرسی الٹی ہوئی تھی۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ

کاغذات فرش پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر ماقہرہ ایک طرف کھڑا لاش کو لے جائے جاتے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہاں صرف وہ

تینوں رہ گئے..... فاروق، سادھنا اور ماقہرہ۔ فاروق اداس ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر پال کے سرد

رویلے اور بے مہری کے باوجود وہ ڈاکٹر کو پسند کرنے لگا تھا۔ ”لاش کس نے دریافت کی؟“

اس نے پوچھا۔

”میں نے۔“ ”ماقہرنے ٹھوڑی کھچاتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے آج مجھے کسی ضروری

کام کی وجہ سے بلایا تھا۔ کام کی نوعیت مجھے معلوم نہیں ہو سکی۔“

”پولیس کو فون کیا آپ نے؟“

ماقہرہ کے چہرے پر بتاؤ نظر آیا۔ ”قدرتی موت تھی تو پولیس کو مطلع کرنے کی کیا

ضرورت ہو سکتی تھی؟“

فاروق نے کمرے کی بے ترتیبی کا جائزہ لیا، جو دھینگا مشتی کی کہانی سن رہی تھی۔

”آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ اس نے ماقہرہ سے پوچھا۔

”میں سند یافتہ فزیشن ہوں۔“

ایک سلسلہ شروع ہوا ہے۔

”پیٹر جون کی موت سے تو تمہارے پروجیکٹ کو فائدہ ہی ہوا۔ زبردست مالی امداد مل گئی بیٹھے بٹھائے۔“

”ٹھیک ہے فاروق۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔ ”ڈاکٹر پال کا پوسٹ مارٹم ضرور ہوگا۔“

☆=====☆=====☆

فاروق سوچ رہا تھا کہ پیٹر جون، بلیئر اور ڈاکٹر پال کی اموات اتفاقیہ تھیں یا منصوبے کے تحت کیے جانے والے قتل۔ بلیئر اور ڈاکٹر پال کے سلسلے میں تو منطقی طور پر قوی امکان موجود تھا کہ کوئی پی آر آئی میں ہونے والے تجربات موقوف کرانا چاہتا ہے لیکن پیٹر جون کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس کی موت نے تو ادارے میں جان ڈال دی تھی اور پھر وہ تو سیکڑوں افراد کے سامنے مرا تھا لیکن یہ حیرت انگیز بات تھی کہ تین افراد مر گئے تھے اور پولیس انکوائری ایک کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پی آر آئی میں حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ بغیر شناخت کرائے کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹام ہنری نے کہا تھا، روحانیت پرست کبھی سائنسی تحقیق کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک یہ عقیدے کا معاملہ ہے اور وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے کہ ان کے عقیدے کے خلاف کچھ ثابت ہو جائے۔ ایسے لوگ ان تجربات کو روکنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس نے سوچا، اسے کم از کم ایک بار ٹام ہنری سے ملنا ہوگا۔

وہ بہت گہری سوچ میں تھا۔ اس نے چونک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ڈرائنگ روم میں اسے بک شیلف نظر آیا..... اور اس کے ساتھ ہی اچانک اسے وہ بات یاد آئی، جسے بلیئر اور ڈاکٹر پال کی موت نے دہرایا تھا وہ اٹھا اور بک شیلف کی طرف لپکا۔ اوپری شیلف پر سرخ جلد والی ایک ہی کتاب تھی۔ اس نے وہ کتاب نکالی۔ کتاب کا ٹائٹل تھا..... ہسٹری آف انگلینڈ..... اس کی سانسیں زکنے لگیں۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے کتاب کھولی۔ صفحات کے درمیان بظاہر کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے سکون کا سانس لیا۔ ہیری فراڈ ثابت ہو گیا تھا۔ اس نے صفحات کو اچھی طرح ٹٹولنے کے خیال سے کور بنایا تو بانڈ نکل آئے۔ وہ پھنی پھنی آنکھوں سے دیر تک کبھی بانڈ زکو، کبھی کتاب کو تکتا رہا۔

بانڈ والے واقعے نے فاروق کو بلا کر رکھ دیا تھا۔ بانڈ ز کے متعلق زرینہ نے بتایا تھا یا

یہ معلومات خود اس کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھیں جو ہیری نے نیلی پیٹی کے ذریعے جان لی تھیں۔ کیا پتا، زرینہ نے کبھی اسے بتایا ہو کہ بانڈ ز کہاں رکھے ہیں..... اور شعوری طور پر اسے یاد نہ ہو۔

وہ آہستہ پنچا تو پتا چلا کہ سادھنا اس کے لیے ایک لفافہ چھوڑ گئی ہے۔ اس نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اس میں ڈاکٹر پال کی پوسٹ مارٹم رپورٹ تھی۔ رپورٹ میں، موت کا سبب کے آگے..... نامعلوم تحریر تھا۔

وہ دفتر سے اٹھا اور ٹام ہنری کے گھر گیا۔ اس نے ٹام کو تمام واقعات تفصیل سے بتائے۔ ٹام نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”سب کو اس ہے، میں تو بھوت پریت لی کہانیوں پر بھی کوئی تبصرہ نہیں کرتا۔ جہاں تک پی آر آئی کے تجربات کا تعلق ہے، میں ان سے بے حد ناخوش ہوں۔ کم از کم ان کے نتائج میں کوئی بھوت تو شامل نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ یہ سب پیٹر جون کا کیا دھرا ہے۔“

”لیکن پیٹر تو مر چکا ہے۔“

”مسج بھی مر چکے ہیں لیکن ان کے بے پناہ اثرات تو اب تک موجود ہیں۔“ دہریے نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ویسے پی آر آئی والے اگر یہ دعویٰ کریں کہ انہوں نے روح کا سراغ لگایا ہے تو میں اسے فراڈ قرار دوں گا۔“

”آپ کے خیال میں وہ لوگ بد دیانت ہیں؟“

”شہرت اور دولت سامنے ہو تو بڑے بڑے ڈگمگاتے ہیں۔“

فاروق سوچ میں گم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ٹام ہنری بھی مذہب اور عقائد کے خلاف دیوانگی کی حد تک ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ تجربات کو زکو انے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہو۔ اگر روح کا وجود ثابت ہو گیا تو بے دین لوگوں کے سر جھک جائیں گے۔ ان کی شرمندگی بے حساب ہوگی۔

”میرے خیال میں پیٹر جون کے وصیت نامے میں کوئی خفیہ شق ضرور ہوگی، جس کی زو سے جانکا دی پی آر آئی کو صرف اس صورت میں ملے گی، جب وہ روح کا وجود ثابت کر دیں۔ اسی لیے وہ لوگ روح کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ٹام ہنری نے خیال آرائی کی۔

”میں نہیں سمجھتا کہ قانون میں.....“

”لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جو چیز موجود نہیں، اس کا وجود ثابت ہی نہیں کیا جاسکتا۔“ ٹام ہنری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ کوششیں تو صدیوں سے کی جا رہی ہیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی، آج تک۔ جو مر گیا، سو مر گیا..... کمائی ختم۔“

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر پال کے تابوت کو قبر میں اتارا جانے والا تھا۔ فاروق اور سادھنا پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ فاروق یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ڈاکٹر پال کو کس نے مارا ہوگا۔ وہاں پی آر آئی کے ٹیکنیشن اور دیگر اسٹاف بھی موجود تھا لیکن ان میں سے کسی کو ڈاکٹر پال کی موت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ البتہ ڈاکٹر ماتھر پر شک کیا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر پال کو جس نے بھی قتل کیا تھا، وہ دواؤں کے بارے میں معلومات رکھتا تھا اور پھر اب وہ پروجیکٹ کا سربراہ تھا۔ یہ ڈاکٹر پال کی زندگی میں ناممکن تھا۔ کام اس انداز میں کیا گیا تھا کہ یا تو موت قدرتی قرار پائے یا بھوتوں کا کارنامہ قرار پائے۔

بھوتوں کا خیال آتے ہی وہ مسکرا دیا۔ تدفین کے بعد وہ سادھنا کے گھر کی طرف چل دیے۔ ”میں تمہیں ایک بات بتاؤں سادھنا سب کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ فاروق نے کہا۔ ”میرے خیال میں ڈاکٹر پال کی موت میں کسی انسان کا ہاتھ ہے۔“

”یعنی قتل؟“

”ہاں بالکل، ارواح پر الزام لگانے کے مقابلے میں تو یہی بہتر ہے۔ تم نے ہی بتایا تھا کہ اس پروجیکٹ کو سبوتاژ کرنے کی خواہش رکھنے والوں کی کمی نہیں۔“

”لیکن قتل کی قیمت پر کوئی اس امر کا خواہاں نہیں اور پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کلین پتھالوجی ظاہر ہوتی ہے۔“

”تو پھر موت کا سبب؟ ممکن ہے کسی روح سے ڈر کی وجہ سے ان کا دل بند نہ ہوا ہو۔“ فاروق نے کہا۔ ”کوئی اور سبب بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”تم پھر قتل کی بات کر رہے ہو۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں..... کوئی ایسا سبب، جو پوسٹ مارٹم رپورٹ میں آہی نہ سکتا ہو۔ کوئی ایسا ذہر، جو اپنی علامت نہ چھوڑتا ہو۔“

”لیکن قاتل کوئی ہتھیار یا چاقو بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ڈاکٹر پال کی موت کس طرح واقع ہوئی۔“

”میرے خیال میں قاتل کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ قدرتی موت ظاہر ہو۔“

”تم تو صرف ایک سنسنی خیز خبر چھاپنا چاہتے ہو۔“

”دیکھو سادھنا.....“

سادھنا نے شدت سے سر ہلایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو بے حد ناخوش دکھائی دے رہی تھی۔ ”دیکھو سادھنا، ہمیں پہلے سامنے کے امکانات کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ پھر بے شک سارا بوجھ روحوں پر ڈال دیتا۔“

”تم خواہ مخواہ سراغ رساں بن رہے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر پال کی موت کا ذمے دار کون ہے؟“ سادھنا نے چڑ کر کہا۔

”میرا خیال ہے، میں قاتل کو جانتا ہوں۔“

☆=====☆=====☆

باہر لنگڑاتے قدموں کی چاپ ابھری اور پھر ڈاکٹر ہریش کمرے میں داخل ہوا۔ فاروق کو بیٹھا دیکھ کر وہ مسکرایا۔ ”ہیلو فاروق، مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اتنا انتظار کرایا۔ دراصل ایک آپریشن میں کچھ غیر متوقع دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔“

فاروق کا جسم تن گیا۔ وہ ایک ایسے شخص سے دوستانہ انداز میں کیسے مل سکتا تھا، جس پر اسے قتل کا شبہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر..... میں آپ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر ہریش اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”تمہارا انداز پولیس والوں جیسا ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بہر حال تمہارے آنے کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ تم نے پلٹنی کے سلسلے میں میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہاں تو صورت حال اور خراب ہو گئی ہے۔ جب تک کہ یہ روحوں کا معاملہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا، لوگ اعضاء کا عطیہ دیتے ہوئے ہچکچاتے رہیں گے۔ ویسے یہ اعتراف کوئی نہیں کرتا کہ ہچکچاہٹ کی وجہ یہ ہے۔“

”اب ڈاکٹر پال کی موت کے بعد ممکن ہے، تجربات کا سلسلہ موقوف ہو جائے۔“

فاروق نے کہا۔ کم از کم اسے تو ایسا ہی لگا کہ اس کے الفاظ سن کر ڈاکٹر ہریش کی آنکھوں میں چمک ابھری ہے۔

”جنم میں جھوٹو ان تجربات کو۔ فضول باتیں ہیں۔“ ڈاکٹر ہریش نے بے پروائی

سے کہا۔ ”کام کی بات کرو۔ اعضا کی پیوند کاری کے متعلق ایک اور فیچر.....“
 فاروق نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”آپ کی پبلیٹی کے معاملے میں میرا موقف اب بھی وہی ہے۔ میں یہاں ڈاکٹر پال کی موت کی وجہ سے آیا ہوں۔ ان کی موت کا سبب معلوم نہیں کیا جاسکا۔ ایسی علامات ملی ہیں جو بتاتی ہیں کہ ممکن ہے انھیں کسی غیر مروجہ طریقے سے قتل کیا گیا ہے اور قاتل کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جو دل کی سرجری سے تعلق رکھتا ہو۔“

ڈاکٹر ہریش نے گہری سانس لی لیکن اس کے انداز میں حیرت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔
 اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“
 ”آپ اتنے حساس کیوں ہو رہے ہیں؟“
 ”تم نے مجھ پر قتل کا الزام لگایا ہے۔“
 ”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ کیا آپ کے سوا اس شہر میں دل کا کوئی اسپیشلسٹ نہیں؟“

”میرا مشورہ ہے کہ کسی اچھے وکیل سے بات کرو۔“ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔
 ڈاکٹر نے ریسیور اٹھایا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ ”مجھے افسوس ہے فاروق لیکن میں مجبور ہوں۔ میں یہ بوجھ اٹھا نہیں پارہا ہوں۔“
 ”میں آپ کو اپ سیٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”تمہاری بات کون کر رہا ہے۔“ ڈاکٹر پھٹ پڑا۔ ”تمہاری خرافات کو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ابھی مجھے فون پر بتایا گیا ہے کہ نو سالہ جگدیش چل بسا۔ بتاؤ..... یہ کوئی عمر ہے مرنے کی؟ میرے نزدیک تم اور تمہارا اخبار اتنا اہم نہیں۔ مجھے اس لڑکے کی موت کا ڈکھ ہے۔ اس کو ایک اچھے دل کی ضرورت تھی جو اسے نہیں مل سکا۔ صرف اس لیے کہ تم نے روحانیت پرستوں کو پبلیٹی دے کر ہماری راہ کھوئی کی۔ تم اس کی موت کے ذمے دار ہو۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ..... اور آئندہ یہاں نظر آئے تو تم اور تمہارا پبلشر دونوں عدالتوں کے چکر کاٹیں گے.....“

☆=====☆=====☆

پادری جوزف گل سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر پادری نے پوچھا۔

”کو..... بات کچھ آگے بڑھی؟“

”فی الوقت تو میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر پال کے ساتھ کیا ہوا؟“ فاروق نے کہا۔ ایک لمحے کو اسے محسوس ہوا کہ پادری آنکھیں چرا رہا ہے۔
 ”پچھلی بار تم ملے تھے تو تمہیں زندگی کے بارے میں جاننے کی خواہش تھی۔ تم بری طرح الجھے ہوئے تھے۔“

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے کہا تھا، مجھے کسی چیز کی پروا نہیں۔ مجھے تو اب یہ تجسس ہے کہ سائیکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں کیا چکر چل رہا ہے۔“
 ”تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو؟“ پادری چھت اور دیوار کے نقطہ اتصال پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ”یہی کے وہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں روحوں کا ہاتھ ہے؟ لیکن میں کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ کیونکہ مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔“
 ”میرے خیال میں یہ روحوں کی نہیں، شیطان صفت جیتے جاگتے انسانوں کی کارستانی ہے۔“

پادری، فاروق کو بغور دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”تم یہ جاننے آئے ہو کہ اس میں، میں کیا کردار ادا کر رہا ہوں۔“
 فاروق کو ایسا لگا کہ پادری کو احساس جرم بری طرح ستا رہا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اگر میں نے ایسی کوئی بات کی ہے تو میں شرمندہ.....“

پادری نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”میں تمہیں ایک بات بتاؤں روح کے بارے میں میرا تجسس ختم ہو گیا ہے۔ اب میں پی آر آئی کے تجربات کے حق نہیں ہوں۔“
 ”لیکن کیوں؟“ فاروق سے اپنی حیرت چھپائی نہ گئی۔ ”پچھلی بار تم نے ہی مجھے احساس دلایا تھا کہ ممکن ہے یہاں تجربات سے کچھ بھی ثابت نہ ہو۔ پھر میں نے ہر امکان کا تجزیہ کیا۔ فرض کرو، روح کی موجودگی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں کچھ عجیب نتائج نکلیں گے۔ ایک تو یہ کہ ہم دوسری دنیا کے ماتحت ہیں۔ ان کی منظوری کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں لیکن اس سے بدتر نتائج بھی نکلیں گے۔ ذرا تصور کرو، یہ بھی تو ممکن کہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر روحوں کے زیر اثر ہوں..... معمول ہوں ان کے۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ.....“

”پشپا جیسے لوگ ہم پر حکمراں ہوں۔“ فاروق نے اس کی بات پوری کر دی۔

”پھر یہ سوچو کہ یہ ثابت ہونے کے بعد کس طرح کی دیوانگی ہمیں گھیرے گی۔ قاتل رحم کی اپیل کریں گے..... یہ کہہ کر کہ انھوں نے تو اپنے شکار کو بہتر دنیا کی طرف روانہ کیا ہے۔ کوئی کئے گا..... یہ جرم میں نے نہیں کیا۔ میں تو ایک روح کا آلہ کار تھا۔ انسانوں میں خودکشی کا رجحان بڑھے گا۔ ہر شخص دوسری دنیا میں اپنے پیاروں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ غریب لوگ یہاں کی دشوار زندگی سے بچنے کے لیے وہاں کی دنیا میں پناہ ڈھونڈیں گے.....“

”اسلام میں یہ کوئی پر اہم نہیں۔ خودکشی کو حرام موت قرار دیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کو وہاں پناہ نہیں سخت عذاب ملے گا۔“

پادری نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ ”میں اب ان تجربات کے خلاف ہوں۔ خدا کے راز خدا ہی کے پاس رہنے دیئے جائیں تو بہتر ہوگا۔“

”تو آپ یہ امید کر رہے ہیں کہ پی آر آئی کو اپنے تجربات میں ناکامی ہوگی۔“

”ظاہر ہے۔ خدا کے راز خدا کی مرضی کے بغیر کسی پر ہویدا نہیں ہو سکتے۔“

فاروق نے بات بدل کی کام کی بات پوچھی۔ ”فادر! آپ کسی طور یونیورسٹی سے منسلک ہیں؟“

”ہاں، میں وہاں اعزازی لیکچرار ہوں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”یونی..... کوئی خاص بات نہیں۔“ فاروق نے کہا۔

☆=====☆=====☆

فاروق دفتر میں بیٹھا ٹائپ رائٹر کو گھورے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر ہریش اور پادری گل سے ملاقات بے سود رہی تھی۔ الجھنیں بڑھ گئی تھیں اور نتیجہ کوئی نہیں نکلا تھا۔ لڑکے کی موت پر ڈاکٹر کا رد عمل اس شک کی نفی کر رہا تھا، جو فاروق کو اس پر تھا۔ سفاک قاتل کسی کی موت پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر نہیں روتے۔

فاروق نے پادری جوزف گل کے قاتل ہونے کے امکان کا جائزہ لیا۔ جوزف گل یونیورسٹی سے متعلق تھا اور پی آر آئی بلڈنگ میں کسی بھی وقت جاسکتا تھا۔ وہ اب تجربات کے خلاف تھا۔ اس کے خیال میں روح کا وجود ثابت ہونا انسانیت کے حق میں سم قاتل تھا۔ وہ خوف زدہ تھا کہ نتائج روح کی نفی بھی کر سکتے ہیں۔ وہ ان تجربات کو روکنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ لوگ خدا کی خاطر..... خدا کے نام پر قتل کرتے رہے ہیں۔ سوال یہ

تھا کہ اگر پادری قاتل ہے تو اس نے قتل کیسے کیا ہوگا؟ زہر، جس کا پوسٹ مارٹم کے وقت بھی سراغ نہ مل سکے۔ اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ اس انداز میں سوچتے سوچتے تو یہ یقینی تھا کہ وہ سادھنا کے قاتل ہونے کے امکان کا بھی جائزہ لینے لگے۔

پھر اس کی جان چھوٹ گئی۔ سلیل گپتا کا بلاوا آگیا۔ ”فاروق..... ابھی ڈاکٹر ہریش چند کا فون آیا تھا۔“ سلیل نے فاروق کو دیکھتے ہی کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس پر ڈاکٹر پال کے قتل کا الزام لگایا ہے۔ یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم؟“

”پاگل ہو گیا ہے وہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ میں نے تو اس سے کچھ سوال کیے تھے۔ اس نے خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا۔“

”دیکھو فاروق، تم پولیس میں نہیں ہو۔ اگر تمہارے پاس اس کے خلاف کچھ ہے تو پولیس کو بتا دو لیکن بھگوان کے لیے.....“

”تم نے میری بات توجہ سے نہیں سنی میں قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے ڈاکٹر ہریش پر کوئی الزام نہیں لگایا۔“ فاروق نے کہا اور پھر سلیل کو تفصیل سے بتایا کہ اس نے ڈاکٹر کی پبلیٹی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر چڑا ہوا ہے۔

”ٹھیک ہے لیکن اب تم اس سے دور ہی رہو اور یہ روح والا فچر بھی چھوڑ دو میں یہ کام کسی اور کو سونپ دوں گا۔“

”لیکن گپتا جی..... یہ کام تو میں نجی طور پر کر رہا ہوں..... آفس ٹائم میں نہیں۔“

سلیل گپتا نے انکار میں سر ہلایا۔ فاروق نے بھی اصرار مناسب نہیں سمجھا۔ سلیل بے حد ضدی تھا مگر وہ بھی اپنے طور پر ارادہ کر چکا تھا کہ یہ موضوع صرف اور صرف اس کا ہے، الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

☆=====☆=====☆

اس روز فاروق دفتر سے جلدی اٹھ گیا۔ اسائن منٹ جھن جانے سے پہلے وہ روح سے متعلق اموات کا معاملہ کر لینا چاہتا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ قاتل پھر وار کرے گا۔ اسے یہ فکر تھی کہ اس بار قتل کا ممکنہ ہدف کون ہوگا۔

راتے میں ایک اسٹور سے اس نے چاقو خریدا۔ ریوالور بغیر لائسنس کے چور بازار سے لیا جاسکتا تھا لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ فی الوقت چاقو سے ہی کام چلانا تھا۔ مگر اس نے

تہیہ کر لیا تھا کہ ریوالور کے لائسنس کے لیے فوری طور پر درخواست دے گا۔ راستے میں وہ سادھنا کے لیے فکر مند رہا۔ سادھنا ان معاملات میں پولیس کو ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ گھر کی طرف جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سادھنا کے گھر کی طرف کر دیا۔ روحوں پر سادھنا کے یقین کو سوچ کر اسے حیرت ہونے لگی۔ کاش..... وہ کسی طرح سادھنا اور ڈاکٹر ماتھر کو قاتل کر سکے۔ روح کے چکر میں تو وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں احساس ہی نہیں تھا کہ کوئی سفاک قاتل بھی ان اموات کا ذمے دار ہو سکتا ہے۔

سادھنا اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ وہ فوراً ہی اس کے لیے چائے بنا کر لائی اور اس کے برابر بیٹھ گئی۔ اس کے وجود سے اٹھنے والی مہک نے چند لمحوں کے لیے فاروق کو ہر احساس سے ماوراکر دیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ یہاں اچانک کیوں آیا ہے۔

”اب بتاؤ اچانک کیوں آئے ہو؟ یہ ایکسائیٹ منٹ کیسا ہے؟“ سادھنا نے پوچھا۔
”دیکھو سادھنا تم روحوں پر یقین رکھتی ہو، میں نہیں رکھتا اگر تم جاننا چاہتی ہو کہ بلیئر اور ڈاکٹر پال کو کس نے قتل کیا تو ہیری اور پرتاپ سے مدد کیوں نہیں لیتیں۔ وہ تو ان دونوں سے براہ راست رابطہ بھی کر سکتا ہے۔“

سادھنا نے اسے بغور دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں اڑا رہا ہے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ بولی۔ ”چتا نہیں.....“ عجب بات ہے۔ پیچھے کئی دنوں سے دوسری دنیا سے ہمارا رابطہ قائم ہی نہیں ہو رہا ہے۔ ہمارے معمول کو شش کر کے تھک گئے ہیں۔ نہ جانے کیا گزربو ہے۔“

”تم نے کیا مطلب نکالا اس سے؟“ فاروق نے پوچھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ کیا روحوں بھی ہڑتال کرتی ہیں۔ مگر اس نے عین وقت پر خود کو روک لیا۔

”میرا خیال ہے کہ روحوں ہمیں اپنے بارے میں تفتیش نہیں کرنے دینا چاہتیں۔ وہ ہم سے خفا ہیں اور فاروق مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

ڈر رہی ہو تو تجربات سے دستبردار کیوں نہیں ہو جاتیں۔ کیا یہ تجربے تمہارے لیے بے حد اہم ہیں؟“

”کامیابی کے قریب پہنچ کر پیچھے نہیں ہٹا جاتا۔“

”چھوڑو فضول باتوں کو۔“

”اب ہمیں کوئی نہیں روک سکتا فاروق!“ سادھنا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر کہا۔

”بڑا صادق جذبہ ہے تمہارا۔“

سادھنا نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”تمہارا آئیڈیا ایک اور وجہ سے بھی بے سود ہے۔ ڈاکٹر پال کی روح سے رابطہ ہو بھی گیا تو میرے خیال میں وہ عقدہ کشائی نہیں کرے گا۔ کیونکہ اب وہ بھی اسی دنیا کا باسی ہے۔ اسے ان کے درمیان رہنا ہے۔ وہ ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکے گا۔“

”یہ سب بکواس ہے۔ دیکھو سادھنا تم خطرے میں ہو۔ روحوں سے نہیں، تمہیں کسی سفاک قاتل سے خطرہ ہے۔“

سادھنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ روحوں کا چکر ہے اور وہ ہمیں پھر ڈرانے کی کوشش کریں گی۔ خاص طور پر آئندہ جمعے سے پہلے۔“
”کیوں..... جمعے کو کیا ہونے والا ہے؟“

”چتا نہیں، مجھے تمہیں بتانا چاہیے یا نہیں۔“

”میں پہلے بھی کم نہیں جانتا۔ اب اس مرحلے پر کیوں اتنی محتاط ہو رہی ہو؟“

”ہم نے ڈیٹھ چیمر بنایا ہے..... بالکل بند..... روحوں نے اب تک جان لیا ہوگا کہ ہم کسی مرنے والے کی روح کو قید کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرا خیال ہے، ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ اس طرح ہمیں دوسری دنیا کی فریکوئنسی کا علم ہو سکے گا۔ ہم روح کا تجزیہ کرنے کو کوشش کریں گے۔ اس میں سے کرنٹ گزاریں گے اور.....“
”ایک منٹ۔“ فاروق نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اس روح کے حصول کے لیے کیا تم لوگ کسی کو قتل کرو گے؟“

”ہاں، یہی سمجھ لو۔“ سادھنا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”بھینٹ کا مطلب سمجھتے ہو؟“

”لیکن یہ خلاف قانون ہے۔“ فاروق اس کی سنجیدگی دیکھ کر دہل گیا۔

اس فکر نہ کرو۔ ہم کوئی نہ کوئی صورت نکال لیں گے۔“

☆=====☆

فاروق اپنے گھر پہنچا تو بے حد غصے میں تھا۔ غصہ اسے سادھنا پر آ رہا تھا۔ پہلے تو وہ اس پر رضامند نہیں تھی کہ اسے ڈیٹھ چیمر کا تجربہ دیکھنے کی اجازت دے لیکن اس کے

اصرار پر وہ جھک گئی۔ اس نے کہا کہ وہ ماتھر سے پوچھ کر بتائے گی۔ پھر اس نے بڑی سرد مہری سے اسے رخصت کیا۔

فرسٹریشن اتنا زیادہ تھا اور نسوانی قربت کی خواہش اتنی شدید کہ نیند ابھی نہیں سکتی تھی۔ وہ پشپا کے گھر چلا گیا۔ پشپا اس سے بڑی گرم جوشی سے ملی لیکن وہاں پہنچ کر فاروق کا جوش سرد پڑ گیا۔ اس کے دماغ پر پھر روح سوار ہو گئی۔ اس نے سائیکل ریسیرچ انسٹیٹیوٹ میں ہونے والے واقعات کے بارے میں پشپا کو بتایا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ وہاں کے معمول گزشتہ کئی دنوں سے دوسری دنیا سے رابطہ نہیں کر پارہے ہیں۔ ”میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں پشپا۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں، تم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر پتا لگاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟“

پشپا کے چہرے پر تناؤ نظر آیا۔ ”میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ اپنے سائنس داں دوستوں سے کہو کہ روحوں پر تجربات موقوف کر دیں۔ ورنہ وہ بدروحوں کی زد میں آجائیں گے۔“

☆=====☆=====☆

ڈاکٹر ماتھر نے فاروق کی بات پوری توجہ سے سنی۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”فاروق، ڈاکٹر پال اس تجربے میں تمہاری شمولیت کے خلاف تھے۔“
سادھنا نے کہا۔ ”یہ درست ہے لیکن اب وہ ہم میں موجود نہیں۔“
”لیکن اس اعتبار سے تم مشکوک قرار پاتے ہو۔“ ماتھر نے کہا۔ پھر سادھنا کا منہ دیکھ کر جلدی سے معذرت کر لی۔
”میں آپ کی معذرت قبول کر سکتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے اس تجربے کا مشاہدہ کرنے کی اجازت دے دیں۔“
”اس سے فائدہ ہی ہوگا ڈاکٹر! ایک صحافی ہمارے تجربے کا چشم دید گواہ ہوگا۔“
سادھنا نے کہا۔

ماتھر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن پہلے بورڈ سے اجازت لینا ہوگی۔“
”اتنی سی بات کے لیے اجازت؟“ سادھنا نے بے نیازی سے کہا۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو ڈاکٹر؟“

”یہ کس بورڈ کا تذکرہ ہے؟“ فاروق نے پوچھا۔
”مشاورتی بورڈ ہے۔ اس کے کچھ اراکین کا تعلق یونیورسٹی سے ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر ہم کسی پر کوئی تجربہ نہیں کر سکتے۔“ ماتھر نے وضاحت کی۔ ”خیر..... میرا خیال ہے، اس سلسلے میں بورڈ کی اجازت لینا ضروری نہیں۔ ہم تم پر تو کوئی تجربہ نہیں کر رہے ہیں لیکن ہماری اجازت کے بغیر تم چھاپو گے کچھ نہیں۔“
”یہ میرا وعدہ ہے۔“

”اور اگر روحوں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تو تم خود ذمے دار ہو گے۔“
”میرا خیال ہے، ایسا ہوا تو مجھے آپ سے شکایت کا موقع ہی نہیں ملے گا۔“

☆=====☆=====☆

ڈبٹہ چیمبرنی آر آئی بلڈنگ کے ٹاپ فلور پر بنایا گیا تھا۔ وہ پندرہ فٹ چوڑا اور بیس فٹ لمبا بالکل بند کمر تھا۔ چھت پر طرح طرح کے آلات نصب تھے۔ چیمبر میں ایک طرف ایک پلنگ تھا، جس کے عین اوپر چھت سے ایک جار لٹک رہا تھا۔ جار سے کچھ ٹیوبس اور کچھ تار منسلک تھے، جو ایک پیچیدہ انسٹرومنٹ سے منسلک تھے۔

ماتھر نے فاروق کو جار کو گھورتے دیکھا تو بولا۔ ”اس جار میں ایک تھرماس ہے۔ اس میں ہوا کی طرح کا کوئی بھی غیر مرئی مادہ جمع کر کے اس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے۔“
”تو پھر یہ چیمبر بند کیوں ہے؟“

”ہمیں موت کے وقت ہونے والی تمام ظاہری تبدیلیاں ریکارڈ کرنا ہیں۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کیمروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انفراریڈ فوٹو گرافی..... مگر ہمیں اس سے بھی بہتر چیز میسر ہے۔ تم نے کبھی کیرملین فوٹو گرافی کا نام سنا ہے؟“ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہم مریض کو ایک ہائی ویلیج فیلڈ پر لٹائیں گے۔ پھر ہم حرارت اور روشنی تک کو ریکارڈ کر سکیں گے۔ اگر جسم میں لافانی روح ہوتی ہے تو ہمارا یہ آلہ اسے بھی ریکارڈ کر لے گا۔“

فاروق چھت سے لٹکے ہوئے کیمروں کو دیکھتا رہا۔ ماتھر فخریہ انداز میں مسکرایا۔ ”ہمارے پاس بیک اپ سسٹم بھی ہے..... شلیرن فوٹو گرافی۔ اس کی مدد سے ہوا کے ہماؤ میں ہونے والی مداخلت کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یعنی فوٹو الیکٹرک شعاعوں کی مدد سے ہم وہ چیزیں بھی دیکھ سکتے ہیں جنہیں انسانی اور کیمرے کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ مثلاً جسم سے

متوقع موت کا درست وقت بتاتی ہے۔ چھیانوے فیصد موقعوں پر یہ درست ثابت ہوا ہے۔“

”کاش کوئی ایسی مشین بھی ہوتی جو روحوں کی مداخلت کے بارے میں وارننگ دے سکتی۔“ سادھنا بولی۔

ڈاکٹر ماتھر نے منہ بنا کر کہا۔ ”ان کی مجھے پروا نہیں میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ایک روح قید کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”تو آپ کو اپنے اس ڈیٹھ چیمر پر پورا اعتماد نہیں؟“ فاروق نے کہا۔

”اگر میں کامیاب ہو گیا تو پھر اسے قابل اعتبار سمجھوں گا۔ ورنہ نہیں۔“ ماتھر نے کہا۔ پھر بولا۔ ”مانیٹر کے مطابق ابھی بڑی بی کی زندگی کے اٹھارہ منٹ باقی ہیں۔“

”اب ہم ۱۹۰ء کے مقابلے میں کافی آگے آگئے ہیں۔“ سادھنا بولی۔

”۱۹۰ء میں کیا ہوا تھا؟“ فاروق نے پوچھا۔

”امریکہ کے ایک سائنس داں ڈنکن میکڈوگل نے ایک قریب المرگ مریض کو بے حد حساس ترازو پر لٹایا تھا۔ اس نے ایسے کئی تجربے کیے۔ بعد میں اس نے بتایا کہ موت کے بعد آدمی کا وزن ۲۱ گرام گھٹ جاتا ہے۔ یہ روح کا وزن قرار پایا۔..... ۲۱ گرام۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔ ”اب شاید ہم اس تجربے کو آگے بڑھانے والے ہیں۔“

”لیکن روحوں آپ کے آلات میں گڑبڑ بھی تو کر سکتی ہیں۔“ فاروق نے کہا۔

”ایسا ہوا تو کم از کم ہمیں اس خرابی کا علم ضرور ہو جائے گا۔ ہم نے آلات کے ساتھ ڈیٹیکٹر نصب کیے ہیں۔“

”لیکن ہم نے اپنے لیے حفاظتی انتظامات نہیں کیے۔“ سادھنا نے کہا۔ ڈاکٹر ماتھر دور کسی آلے کو چیک کر رہا تھا۔ سادھنا نے فاروق سے کہا۔ ”تم اب بھی واپس چلے جاؤ۔“ اس نے فاروق کا بازو سختی سے تھام لیا۔ ”ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے، یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

فاروق کو اس کی بات پر نہیں اس کے خوف پر غصہ آگیا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”بچوں کی سی باتیں مت کرو۔“

ٹھیک سترہ منٹ بعد بیمار ضعیف پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔ کمرے کی فضا آلات کی گھوں گھوں سے گونجنے لگی اور کیرے حرکت میں آگئے..... پھر ماتھر نے کہا۔ ”یہ مریض کی

جدا ہونے والی کوئی بھی غیر مرئی چیز..... چاہو تو اسے روح کہہ لو۔“

فاروق نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔ ”واقعی..... سائنس نے بہت ترقی کی ہے۔“

”اور اب اس سلسلے میں کسی فراڈ کی گنجائش نہیں۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔

فاروق نے سر کو تھپسی جنبش دی اور ان سائنس دانوں کو اور تیکنیک کاروں کو دیکھتا رہا، جو اس تجربے میں شامل تھے۔ چیمر میں روشنی کردی گئی تھی۔

پھر مریض کو اسٹریچر پر ڈال کر چیمر میں لایا گیا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جس کے کمزور چہرے پر جھریاں ہی جھریاں تھیں۔ وہ اتنی کمزور تھی کہ ایک نرس نے اسے بہ آسانی اٹھا لیا..... اور بیڈ پر لٹا دیا۔ ڈاکٹر ماتھر نے فاروق سے کہا۔ ”اس عورت کی عمر اکیاسی سال ہے۔ اس نے بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اس کے لیے دکھی ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ اذیت میں ہے۔“

”تم مر رہے ہوتے تو تمہیں بھی اذیت ہوتی۔“ ماتھر نے کہا۔ ”ویسے اس وقت یہ مسکن دواؤں کے زیر اثر ہے۔ اسے ذرا بھی تکلیف نہیں ہو رہی ہوگی۔ یہ اینٹی بائیوٹکس سے تنگ آگئی تھی۔ اس نے خود اسپتال والوں سے درخواست کی کہ اسے ہمارے سپرد کر دیا جائے۔“

فاروق نے دیکھا، عورت کے پتلے پتلے ہاتھ بیڈ سے نیچے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ چھت کو گھور رہی تھی۔

”ہم نے اسپتالوں سے رابطہ قائم کیا تھا کہ کوئی نزع کے عالم میں مریض ہمیں دے دیا جائے۔ اس خاتون نے ہاں بھری۔ اگرچہ اس کے گھر والے اس کے خلاف تھے لیکن یہ شاید اپنے متعلقین سے نفرت کرتی ہے۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔ پھر اس نے موضوع بدلا۔

”ابھی چند منٹ میں ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ کب مرے گی۔“

”یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟“ فاروق نے پوچھا۔

”ڈیٹھ چیمر کبھی ڈیٹھ مانیٹر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر نے پلنگ کے قریب چوک باکس ٹائپ مشین کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس میں دھڑکنوں کی رفتار، بلڈ پریشر، تنفس، درجہ حرارت..... غرض ہر چیز کا حساب کتب ریکارڈ ہوتا رہتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ یہ

چاہیے۔“ ڈاکٹر ماتھر نے جواب دیا۔ ”اب ہمارا ایک ایجنٹ دوسری دنیا میں جاسوسی کے لیے جائے گا۔ میں اسے جاسوس نہیں، سفارت کار کوں گا۔ وہ ہماری نیک تمنائیں عالم ارواح کے بانیوں کو پہنچا کر واپس آئے گا۔“

”واپس آئے گا؟“ فاروق کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”ہاں، ہم جانا چاہتے ہیں کہ روحوں کا رد عمل اتنا معاندانہ کیوں ہے۔ انھیں ہماری طرف سے کیا پریشانی ہے۔ اب تک وہ دو آدمیوں کو ختم کر چکی ہیں۔“

”اور وہاں کون جائے گا تمہاری طرف سے؟ دن وے نکٹ والی کوئی بوڑھی خاتون تو تمہاری نمائندگی نہیں کر سکتی۔ واپسی کا نکٹ بھی ضروری ہے۔“

”سب بندوبست ہو جائے گا۔ اب تو ہمارے پاس مالی وسائل بھی ہیں۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔

فاروق کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کہانی مکمل ہونے سے پہلے ٹلے گا ہی نہیں۔ ماتھر نے اس سے کہا۔ ”تم تجربہ مکمل ہونے تک ایک لفظ بھی نہیں چھاپو گے۔“

”میں وعدہ کر کے پوٹھیا نہیں۔“

”تو سنو، ہم اپنے سفیر کو الیکٹرک شاک کے ذریعے عارضی موت سے ہمکنار کریں گے۔ اس کا دل روک دیا جائے گا۔ سرجیکل رومز کے لیے یہ جانا پہچانا طریقہ ہے۔ ہمیں چند ہی منٹ بعد دل کو دوبارہ متحرک کرنا ہو گا۔ زیادہ دیر ہونے کی صورت میں دماغ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہمارے لیے وہ چند منٹ بہت کافی ہوں گے۔“

”کس اعتبار سے؟“

”دوسری دنیا سے رابطے کے لیے۔“ ڈاکٹر ماتھر نے جواب دیا۔

”روحیں تمہارے سفیر کو اپنی دنیا میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں گی؟“

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ہمیں پر تپ اور ہیری سے بہت مدد ملے گی۔ ہیری تجربے کے وقت موجود رہے گا۔ پر تپ ہمارے سفیر کی رہنمائی کرے گا۔“

”اس میں اگر کسی کے لیے خطرہ ہے تو صرف ہمارے سفیر کے لیے ہے۔“ سادھنا

بولی۔ ”دماغ آکسیجن کی کمی صرف تین منٹ تک برداشت کر سکتا ہے۔ تین منٹ کے بعد

اس کے خلیے مرنے لگتے ہیں اور کوئی خلیہ ایک بار مرجائے تو کبھی زندہ نہیں ہو سکتا۔“

”ڈی فلبریننگ مشن کا استعمال عام ہے۔ اس پر انحصار کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا

ہیں۔“

”اگر کچھ ہوا ہے تو اب ہو گا۔“ سادھنا نے بیچانی لہجے میں کہا۔

کنٹرول روم کے اسکرین پر کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ڈاکٹر ماتھر کے چہرے پر مایوسی نظر آنے لگی۔ ٹیکنیشنز ڈانکوں پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔

”ہم بات تو کر سکتے ہیں نا؟“ فاروق نے پوچھا۔ سادھنا اپنی کرسی پر بار بار پسو بدل رہی تھی۔ اضطراب نے اس کی سانسوں کی لے تیز کر دی تھی۔

”کیوں نہیں، بات نہیں کریں گے تو وقت کیسے کٹے گا۔ ہمارا انتظار طویل ثابت ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر ماتھر نے جواب دیا۔

”نکلتا طویل؟“

تمہیں یاد نہیں، پیٹر جون نے کہا تھا..... چوبیس گھنٹے۔“ ڈاکٹر ماتھر کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

☆=====☆=====☆

ڈیٹھ چیمر میں بارہ گھنٹے گزارنے کے بعد فاروق باہر نکلا اور پکن کی طرف چل دیا۔ اس نے دفتر فون کر کے معلوم کیا کہ اس کے لیے کوئی پیغام تو نہیں ہے۔ وہ واپس آیا تو

ماتھر کو مایوس پایا۔ ”کھیل ختم پیسہ ہضم۔ اب مجھے سادھنا سے نتائج ملانے کا موقع.....“

”دیکھیں ڈاکٹر، اب مجھ سے یہ راز داری والا کھیل نہ کھیلیں مجھے بتائیں، آپ کے آلات کیا کہتے ہیں؟“ فاروق نے جھجکا کر کہا۔

”مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں جسم سے کسی ایسی چیز کے اخراج کی شہادت نہیں ملی، جسے روح کہا جاسکے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ روح محض افسانہ ہے؟“

”میں نے یہ نہیں کہا۔“ ڈاکٹر ماتھر نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے کہا ہے کہ ہمیں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی، جس سے جسم سے روح کے نکلنے کا پتا چلتا۔ ویسے تم سائنس کے آدمی ہو۔ جانتے ہو کہ بہت سی چیزیں جو ابتدا میں مسترد کر دی گئیں، بعد میں حقیقت ثابت ہوئیں۔“

”اب ہم کیا کریں گے؟“ سادھنا نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے، اب ہمیں ڈاکٹر پال کے ہنگامی منصوبے پر عمل درآمد کرنا

ہے۔ میرے خیال میں ہمارے سفیر کے لیے کوئی خطرہ نہیں۔“ ڈاکٹر ماتھر نے سادھنا سے اختلاف کیا۔

”اگر یہ مشین استعمال کی جاتی ہے تو لوگ دوسری دنیا میں جا کر واپس آتے رہے ہیں۔ آپ نے ان سے معلومات کیوں نہیں کیں؟“ فاروق نے اعتراض کیا۔

”مریض کو کچھ یاد نہیں ہوتا۔ اس کا معاملہ بیماری کا ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر ماتھر نے وضاحت کی۔ ”یہ ایسا ہی ہے جیسے عام طور پر لوگوں کو سوکر اٹھنے کے بعد خواب یاد نہیں ہوتے اور اگر کوئی جسم سے روح جدا ہونے کے بعد کا حال بیان کرتا ہے تو ڈاکٹر اسے خواب سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کچھ لوگوں کا بیان ریکارڈ پر موجود ہے۔“ ڈاکٹر نے ایک کتاب اٹھا کر اس میں سے کچھ تلاش کیا۔ ”یہ ایک ایسے ہی مریض کا بیان ہے۔“ اس نے کہا اور کتاب میں سے پڑھ کر سنائے لگا۔ ”مجھے ایسے لگا جیسے میں آئینے کے روبرو ہوں۔ پھر میں نے خود کو اپنے جسم سے نکلنے دیکھا۔ میں اپنے سر اور کندھوں سے نکل رہا تھا۔ پھر مجھے ناقابل بیان خوشی کا احساس ہوا اور میں نے خود کو ہوا میں تیرتا محسوس کیا۔ اچانک مجھے اپنے بائیں پلو میں تکلیف کا احساس ہوا۔“ ڈاکٹر ماتھر کا اور پھر بولا۔ ”اب آگے کی بات اس کے معالج نے بیان کی ہے۔ وہ کتا ہے۔ مردہ شخص کو الیکٹرک شاک دیئے گئے کئی شاک لگنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں، اس کا دل دوبارہ دھڑکنے لگا تھا۔“ ڈاکٹر نے کچھ توقف کیا، پھر بولا۔ ”ایسے کئی کیس ریکارڈ پر موجود ہیں۔“

ڈاکٹر بولتا رہا۔ فاروق یوں سر ہلا رہا تھا جیسے بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہا ہو لیکن درحقیقت وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ سفارت اچھا آئیڈیا ہے۔ میں اگر اس مشن کے لیے خود کو پیش کر دوں تو کیا رہے؟ اسے اب تک عالم ارواح پر یقین نہیں تھا لیکن ایسا ہونے کی صورت میں وہ ذرینہ اور تمکین سے مل سکتا تھا۔ انھیں بتا سکتا تھا کہ وہ اب بھی ان سے محبت کرتا ہے۔ دوسری طرف اسے دنیا کے عظیم ترین فیچر کا مواد ملتا۔ وہ دنیا کا پہلا رپورٹر ہوتا، جو عالم ارواح میں کچھ دیر رہ کر آیا ہوتا۔ دنیا کا عظیم ترین ایڈوینچر! اور تجربہ ناکام ہوا تو تب بھی وہ رپورٹ ایسی ہوگی کہ اسے اور انڈین ٹائمز کو کہیں کا کہیں پہنچا دے گی۔

اس تجربے میں خطرہ بھی تھا۔ مگر لوگ اس سے پہلے بھی شہرت کی خاطر بڑے بڑے خطرات مول لیتے رہے تھے۔ لوگ تو چاند تک ہو آئے تھے۔ اسے تو صرف تین منٹ

تک اپنے بستر پر مردہ پڑا رہنا تھا۔ خود ایک ایڈوینچر میں حصہ لینا تھا۔ سلیل گپتا کو پہلے سے کچھ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ”میں آپ کے سفیر کی حیثیت سے جاؤں گا۔“ اس نے ڈاکٹر ماتھر کی بات کاٹ دی۔

ماتھر بری طرح چونکا۔ ”کیسی بات کر رہے ہو؟“

”دیکھو۔۔۔۔۔۔ میں ایک ذہین رپورٹر ہوں۔ جو کچھ دیکھوں اور سنوں گا، اسے پوری طرح کانڈ پر منتقل کرنے کی اہلیت مجھ میں عام لوگوں سے زیادہ ہے۔ میں تمہارے اغراض و مقاصد سے بھی آگاہ ہوں۔ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے بھی میں فٹ ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی رونا والا۔۔۔۔۔۔ پوچھنے والا نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ میں اس تجربے سے خائف بھی نہیں ہوں۔“

”خائف نہ سہی، میرے خیال میں تم پاگل ضرور ہو۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔ سادھنا نے ڈاکٹر کی تائید میں سر ہلایا۔ ”ہمیں ایک سائنٹک محقق کی ضرورت ہے، جسے ہمارے مسائل کا شعور ہو۔“

”اس کام میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔“

سادھنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جب امریکا میں خلائی پروگرام کا آغاز ہوا تو ہزاروں افراد نے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا لیکن چند تجربے کار ہوا بازوں کو منتخب کیا گیا۔“ ”یہ مختلف ہے۔ مجھے جہاز تو نہیں اڑانا ہوگا۔ مجھے تو صرف سلا دیا جائے گا اور میں جاگنے کے بعد بتاؤں گا کہ میں نے نیند میں کیا دیکھا کیا سنا۔“ ”ہمیں بھی تجربے کار۔۔۔۔۔۔“

ڈاکٹر ماتھر نے ہاتھ اٹھا کر سادھنا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”فاروق، کہہ رہا ہے سادھنا۔ اس صورت میں ہم رضا کار کی تلاش میں خوار ہونے سے بھی بچ جائیں گے اور باہر کے کسی آدمی کو کچھ پتا بھی نہیں چلے گا ورنہ سوچو، تجربے سے پہلے یہ خبر اڑ گئی تو لوگ اخلاق کے ڈنڈے ہاتھوں میں لے کر ہم پر پل پڑیں گے لیکن فاروق کو استعمال کرنے کی صورت میں رازداری بھی رہے گی۔“

سادھنا نے فاروق سے پوچھا۔ ”تم یہ کام کرنے پر مصر کیوں ہو؟“

”میرے اپنے فائدے بھی ہیں۔ میں صحافی ہوں اور یہ ایک ایسی بڑی خبر ہے، جس کا مرکزی کردار بھی میں ہی ہوں۔ اس خبر کی اشاعت کے تمام حقوق صرف اور صرف

میرے ہوں گے۔ میں اسے صرف انڈین ٹائمر کو نہیں دوں گا، کسی بڑے انٹرنیشنل میگزین میں بھی شائع کراؤں گا اور اگر موقع ملا تو اسے کتابی صورت میں شائع کراؤں گا۔ کیا پتا ہی دی والے بھی اس میں دلچسپی لیں۔ ممکن ہے، کوئی فلم بن جائے اس کہانی پر۔“

”ہمارے ادارے میں نہ جانے کتنے لوگ اس تجربے کے لیے تیار ہوں گے۔“ سادھنا نے معترضانہ لہجے میں کہا۔ ”ہمیں فاروق کو خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ماتھر کے چہرے کے تاثر سے اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے غلط بات کہہ دی ہے۔

تاہم ماتھر نے اعتراض کیا تو اس کے لہجے میں دوستانہ دلچسپی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے سادھنا کہ ہم ایک اجنبی کے بجائے اپنے شاف کو خطرے میں ڈالیں تو کوئی حرج نہیں؟“

”فاروق اب ہمارے لیے اجنبی تو نہیں۔“ سادھنا نے جواب دیا۔ اس کے رخسار تہمتا اٹھے۔

”تمہارے لیے نہیں ہوگا۔“ ماتھر نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں تجربے کے پروٹوکول کا تعین کر کے اسے بورڈ سے منظور کرانے جا رہا ہوں۔ باقی باتیں تم دونوں آپس میں طے کرلو۔“

اس کے جانے کے بعد فاروق نے سادھنا سے کہا۔ ”اس معاملے میں کوئی گڑبڑ مت کرنا۔“

”میں جانتی ہوں، تم یہ خواہش کیوں کر رہے ہو۔ جب سے تمہاری بیوی اور بچی گئی ہیں، تم میں خود کشی کا رجحان پیدا ہو گیا ہے لیکن تم میں خود کشی کا حوصلہ بھی نہیں..... اور تم دوبارہ اپنی بیوی تک پہنچنا بھی چاہتے ہو۔“

فاروق کا وجود جھنجھنا کر رہ گیا۔ اسے اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تاہم اس نے زبان سے تردید کی۔ ”میں تو یہ مانتا ہی نہیں کہ کہیں کوئی دوسری دنیا بھی ہے۔ میں تو تم لوگوں کی تھیوری آزما رہا ہوں۔ ایک چٹ پٹی کہانی بونس میں ملے گی۔“ پھر وہ اٹھا اور ٹہلنے لگا۔ ”خود کشی کا رجحان..... مگر..... سادھنا، میں ابھی جینا چاہتا ہوں مجھے یقین ہے، زریںہ کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ وہ کبھی نہیں چاہے گی کہ مجھے کچھ ہو جائے۔“

”میں بھی نہیں چاہتی کہ تمہیں کچھ ہو جائے۔“

”بس..... تم میری واپسی یقینی بنا دینا۔“ فاروق نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

☆=====☆=====☆

فاروق کا جسم تھکن سے چور تھا لیکن نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی اور تکیے کو یوں سینے سے بھینچ لیا جیسی وہ اس کی تمکین ہو۔ اس لمحے اس کا ہاتھ مہربانے رکھے چاقو سے ٹکرایا۔ اس نے چاقو ہاتھ میں تھام کر اسے کھولا اور اس کی دھار پر انگلی پھیری پھر اس نے چاقو کھلا ہوا ہی تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

دوسری دنیا کے سفیر کی حیثیت کا بھجان اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی خیال تھا کہ روح کا وجود ہے بھی یا نہیں۔ ڈاکٹر پال اور بلیر کی موت کے سلسلے میں وہ اب بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس میں انسانی ہاتھ نہیں ہے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر چاقو اٹھایا اور اسے بند کر دیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اسے نیند کی گولی لینا ہی پڑے گی۔ نیند کی گولی لے کر وہ پھر بستر میں آلیٹا۔ اب اسے دوا کا اثر شروع ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ اتنی دیر سوچا جاسکتا تھا۔ اس اپنی عارضی موت کا خیال خوفزدہ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اسے یہ فکر ضرور تھی کہ دوسری دنیا میں اس کا استقبال کس انداز میں ہوگا۔ کیا انھیں پہلے ہی سے اس کی آمد کا علم ہوگا؟

اس خیال کا جواب ذہن میں آتے ہی اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ انھیں یقیناً معلوم ہوگا انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس وقت وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے سوچا، ممکن ہے وہ انھیں سمجھا سکے کہ وہ انھیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ وہ تو خیر گلی کے دورے پر آیا ہے۔ وہ سوچتا رہا..... روحیں اچھی ہوں گی اور بری بھی..... بری وہ جنھیں بد روحیں کہا جاتا ہے۔

اس نے تاریک کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے سوچا، دوسری دنیا میں روحیں اس کا کیا حشر کریں گی؟ اور زیادہ مار ڈالیں گی کیا؟ کیونکہ مرا ہوا تو وہ پہلے ہی سے ہوگا۔ وہ اس خیال سے آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہاں زریںہ تو ہوگی۔ وہ کسی کو اسے تکلیف نہیں پہنچانے دے گی۔

اس کا وجود سکون سے بھر گیا۔ آنکھوں میں نیند اتر آئی چند لمحے بعد اسے اپنی آنکھوں کے قریب روشنی کے گزرنے کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول

دیں۔ روشنی کا ایک پراسرار نقطہ بیڈ روم کے ایک کونے میں متحرک تھا اس کا ذہن نیند کی دوا کے زیر اثر خوف سے کچھ زیادہ متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے سختی سے آنکھیں بھیجنے لیں۔ کوئی حس اسے تنبیہ کر رہی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس میں مداخلت نہ کرے..... سوتا ہی بنا رہے۔ تاہم اس کا جسم متوقع حملے کے احساس سے تن گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور پیٹ میں اینٹھن سی ہونے لگی۔

اسے احساس ہوا کہ اس کے پاس کچھ مہلت ہے۔ مداخلت کار کی نظر ابھی کمرے کی تاریکی سے ہم آہنگ نہیں ہوئی ہوگی۔ اس نے آنکھوں میں جھری سی بنا کے دیکھا مگر اسے فرنیچر کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے سوچا، ممکن ہے درحقیقت کوئی گزربونہ ہو اور یہ محض اس کے نیند اور خواب آور دوا کے مارے ہوئے ذہن کا کرشمہ ہو لیکن کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس بے حد شدید تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بیڈ کی سائیڈ میں لٹکایا اور نیچے سے اپنا جوتا اٹھا کر دوسری طرف اچھال دیا۔ اس طرح وہ مداخلت کار کی توجہ بھٹکا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بستر سے کود کر بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ بیڈ کے نیچے رکھے ٹائپ رائٹر سے اس نے ہینڈل کھینچ کر نکال لیا۔ وہ ہینڈل بوقت ضرورت خطرناک ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔

اچانک کمرہ کھانسی کی آواز سے بھر گیا۔ وہ جانی پہچانی کھانسی تھی۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بالآخر اسے یاد آگیا۔ پیٹر جون اسی انداز میں کھانستا تھا۔ اس کا جسم تن گیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ ”کون ہے؟ کیا بات ہے؟“ وہ چلایا۔ ایک شعلہ سا چمکا..... اور شعلے کے وسط میں کسی کا سر اور کندھے نظر آئے۔ کھانسی کی آواز جاری تھی۔ پھر کسی نے کھانسی کے درمیان پکارا۔ ”فاروق..... فاروق بلال!“

”کون ہو تم؟“

”میں پیٹر جون ہوں۔“

”کیا بے ہودہ مذاق ہے۔ خدا کے لیے مجھے سونے دو۔“

”فاروق..... تم ہماری دنیا میں نہ آنا۔“

فاروق بیڈ کے نیچے سے نکلا اور اس نے نیبل لیپ کا سوئچ آن کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ شعلہ، سر اور کندھے غائب ہو گئے۔ ”ہاں مسٹر پیٹر! تم کیا کہہ رہے تھے؟ مجھے

تم سے ایک بات پوچھنی ہے؟“ وہ چلایا۔

لیکن کمرے میں خاموشی تھی۔ فاروق اس کونے کی طرف جھپٹا، جہاں اس نے وہ شعلہ دیکھا تھا۔ اس نے فرش اور پھر چھت کا جائزہ لیا کہیں کوئی علامت نہیں تھی۔ البتہ جس جگہ اس نے وہ شعلہ دیکھا تھا، وہ جگہ بالکل سرد تھی۔ کمرے کی فضا سے یکسر مختلف۔ وہ کھڑکی کے پاس گیا اور پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ کھڑکی بھی بے حد ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ نیچے سڑک سنسان تھی۔ پھر اس نے سوچا کھڑکی کے راستے نہ کوئی آسکتا ہے، نہ جاسکتا ہے۔ اس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ دوسری طرف کمرے کے ایک گوشے میں غیر معمولی ٹھنڈ ہونا بھی کچھ معنی رکھتا تھا اور وہ بھی وہ گوشہ، جہاں اس نے ایک غیر معمولی چیز دیکھ تھی۔ وہ واپس آیا تو وہ گوشہ بھی کمرے کے دیگر حصوں کی طرح گرم تھا۔ فاروق گرمی سانس لے کر رہ گیا۔ اس معاملے کی توجہ نہ کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ بس یہی کہہ سکتا تھا کہ کوئی اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر وہ کون ہے؟ یہ وہ نہیں بتا سکتا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے پیٹر جون کی کھانسی کی جو نقل کی تھی، وہ اصل سے کسی اعتبار سے کمتر نہیں تھی۔ فاروق نے سر کھجاتے ہوئے پورے فلیٹ کا چکر لگایا۔ ہر چیز چیک کی مگر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اب وہ اس فلیٹ میں ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا تھا۔ کیا پتا..... جانے والا پھر لوٹ آئے۔

☆=====☆

سادھنا سوتے سے اٹھی تھی۔ فاروق کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ فاروق نے اسے پورنی روداد سنائی۔ وہ سر ہلاتی رہی پھر اس نے چائے بنائی۔ دونوں گرم چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے دیواروں کو یوں تکتے رہے، جیسے ابھی ان میں سے کوئی بھوت نکل آئے گا۔ ”میں یہ سوچ کر الجھتا ہوں کہ ایسی باتیں آدھی رات کے بعد ہی کیوں ہوتی ہیں، دن میں کیوں نہیں ہوتیں؟“ فاروق نے کہا۔

”میں یہ سوچ رہی ہوں کہ پیٹر جون کی روح نے تمہیں دوسری دنیا میں آنے سے کیوں منع کیا۔ یہ ہے پریشانی کی بات۔ اس کا مطلب ہے کہ رو حیں تمہاری آمد کو مداخلت تصور کر رہی ہیں۔ تمہیں یقین ہے کہ تم نے یہ سب کچھ خواب میں نہیں دیکھا؟“

”نہیں سادھنا، جو کچھ میں نے دیکھا، جاگتے میں دیکھا اور سچ مچ دیکھا، البتہ میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ پیٹر جون کی روح تھی یا وہ مکار قاتل، جس نے بلیئر اور ڈاکٹر پال کو

موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ بہر حال وہ کھانسی سو فیصد پیٹر جون کی تھی۔
”روحیں آتی ہیں تو اکثر اپنی شناخت کے لیے اسی قسم کا مظاہرہ کرتی ہیں۔“ سادھنا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

فاروق کو اپنی پلکیں نیند سے بوجھل ہوتی محسوس ہوئیں۔ ”ایک پیالی چائے اور نہیں مل سکتی؟“ اس نے کہا۔
”ہمیں اب سو جانا چاہیے۔ کل کا دن بہت اہم ہے تمہیں اس تجربے سے گزرنا ہے۔“

”رات کے خوف ناک تجربے سے گزرنے کے بعد سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“
”چلو کوشش تو کرو۔“

وہ اسے بستر کی طرف لے گئی۔ ”میں تمہیں سلا دوں گی۔“ اس نے فاروق کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔
اور فاروق کو واقعی نیند آگئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو تین بجے تھے۔ سادھنا بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بستر میں ہی لیٹا کچھ دیر سوچتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ وہ روح ہو یا کوئی زندہ شخص..... اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس نے سوچا، پولیس سے مدد لی جائے۔ مگر پھر اس نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ پولیس اسے نفسیاتی مریض قرار دے کر مطمئن ہو جاتی۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، خود ہی کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے اپنے دشمن کو تلاش کرنا تھا لیکن نہیں..... پہلے اسے یہ ثابت کرنا تھا کہ روحوں کا وجود ہے اور اس کی ایک صورت موجود تھی۔ وہ بستر سے نکلا۔ اس نے منہ پر پانی کے چھپکے مارے اور سادھنا کے لیے ایک رقعہ چھوڑ کر اس کے فلیٹ سے نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

”کون ہے؟“ ہیری کی آواز نیند سے بوجھل تھی اور لہجے میں برہمی تھی۔
”میں ہوں فاروق بلال..... سادھنا کا رپورٹر دوست۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“
”چلے جاؤ، یہ بھی کوئی وقت ہے آنے کا۔ جانتے ہو صبح کے چار بجے ہیں۔“

فاروق دروازہ پیٹتا رہا۔ آخر ہیری کو دروازہ کھولنا پڑا فاروق اسے دھکیلتے ہوئے کمرے میں گھس گیا۔ ”یہ بد تمیزی ہے؟“ ہیری نے غصے سے کہا۔
”میں پر تپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس وقت؟ پاگل ہو گئے ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میں.....“
فاروق نے اس کی گردن پکڑ لی۔ ”پر تپ کو بلاؤ۔ ورنہ میں ہمیشہ کے لئے تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گا۔“ اس نے غراتے ہوئے کہا۔

ہیری نے خود کو جھٹکے سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن فاروق کی گرفت بے حد سخت تھی۔ ”میں نے کہنا مجھے پر تپ سے بات کرنا ہے۔ بلاؤ اسے۔“ فاروق پھر غرایا۔
ہیری کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس نے بہ مشکل اقرار میں سر ہلایا۔ فاروق نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ کوچ پر گر کر دیر تک ہاپتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں بے پناہ نفرت تھی۔ ”بس اب شروع ہو جاؤ۔ اور یہ نہ کہنا کہ ماحول رابطے کے لیے سازگار نہیں ہے۔“ فاروق نے کہا۔

”ممکن ہے رابطہ نہ ہو سکے۔ یہ میرے اختیار کی بات تو نہیں۔“
”کوشش کرو۔ یہ بہت اہم ہے۔ زندگی اور موت کا دار و مدار ہے اس رابطے پر۔“
ہیری نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں برکھے اور آنکھیں موند لیں۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ چند لمحے وہ آنکھیں بند کیے رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”رابطہ ہوا؟“
فاروق نے پوچھا۔
”نہیں۔“

”تم خبیث، جھوٹے..... تمہیں معلوم ہے کہ رابطہ نہیں ہوا۔“ فاروق غرایا۔
ہیری اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں جو کچھ کر سکتا تھا، میں نے کیا۔ اب تم چلے جاؤ۔“
فاروق نے اسے دوبارہ کوچ پر دھکیل دیا۔ ”پھر کوشش کرو۔ میں کچھ معلوم کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔“

ہیری نے اچانک ہی فاروق کی ناف سے نیچے کی جگہ کو ٹھوکر سے نشانہ بنایا۔ فاروق تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ پھر بھی اس نے اندھا دھند گھونسا چلایا۔ گھونسا ہیری کو ٹھوڑی پر لگا۔ ہیری کا سر کرسی سے ٹکرایا۔ وہ لٹو کی طرح گھوما اور پھر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ فاروق سہم گیا۔ اس نے جھک کر ہیری کی نبض دیکھی اور سکون کی سانس لی۔

”ایک بات اور پرتاپ، تمہاری اور میری دنیا میں ان دنوں رابطہ کیوں منقطع ہو گیا ہے؟“

”ہم لوگوں کو اس دنیا کی تکلیف دہ زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم بہت خوب صورت زندگی گزار رہے ہیں اور اس میں رخنہ اندازی نہیں چاہتے۔“

”ایک آخری سوال۔“

”نہیں، اب مجھے بلایا جا رہا ہے۔“

”کون بلا رہا ہے تمہیں؟ مجھے یہ بتاؤ، کیا بلبیر اور ڈاکٹر پال کی موت روحوں کے ہاتھوں ہوئی ہے؟ کیا روحوں ان تجربات کو روکنا چاہتی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کیوں روکنا چاہتی ہیں؟ کیا پیٹر جون کی روح مجھ سے ملنے آئی تھی؟ پرتاپ..... جواب دو.....“

پرتاپ کراہا۔ اسی لمحے ہیری کسمایا۔ اب کراہنے کی آواز ہیری کی تھی۔ پرتاپ کی نہیں.....

☆=====☆=====☆

فاروق نے مینٹل ہسپتال میں اپنا پریس کارڈ دکھایا اور بتایا کہ وہ سکندر سے ملنا چاہتا ہے۔

”میں سکندر صاحب کا بھتیجا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”حیرت ہے، ہم تو سمجھتے تھے کہ ان کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔“

فاروق نے سر ہلایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ جھوٹ چلے گا بھی یا نہیں۔ اب وہ ایک ایسے باپ کا بیٹا بننے کو تیار نہیں تھا جسے وہ آج سے پہلے جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ ایسے شخص کی پروا کیوں کرے..... اس کی نگہداشت کی ذمہ داری کیوں قبول کرے، جس نے کبھی اس نگہداشت کی ذمہ داری کیوں قبول نہیں کی تھی۔ وہ تو یہاں کسی اور وجہ سے آیا تھا۔

”میں دس سال بعد ان سے مل رہا ہوں۔“ اس نے وارڈ بوائے سے کہا۔ ”میں مصروف ہی اتار رہتا ہوں۔“

”اب تو وہ بہت بدلے ہوئے لگیں گے آپ کو۔ ان کے ہوش و حواس بالکل رخصت ہو چکے ہیں۔ اپنا کوئی کام خود نہیں کر سکتے۔“

وارڈ بوائے فاروق کو ایک وارڈ میں لے گیا۔ اس میں بیچا بل بیٹہ تھے۔ بھانت بھانت کے مریض تھے۔ پاگل خانے کا مخصوص ماحول تھا۔ فاروق کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں

اس وقت ہیری کے کھلے ہوئے منہ سے پرتاپ کی آواز نکلی۔ ”میں آگیا ہوں.....“

میں آگیا ہوں۔“

فاروق کو یقین ہو گیا کہ اس وقت یہ ہیری کی بنائی ہوئی آواز نہیں ہے۔ ہیری تو بے ہوش تھا۔ ”ہیلو ننھے!“ پرتاپ نے مزید کہا۔

”مجھے اس نام سے مت پکارو۔“

”کیوں؟ تمہاری اماں بھی تو پکارتی تھی۔“

”میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ میری ماں تھی؟ ٹیلی پیٹھی کا کوئی چکر نہیں تھا کیسے یقین کر لوں کہ تم اس وقت بھی میرا ذہن نہیں پڑھ رہے ہو؟ میرے ذہن میں تو وہ باتیں بھی ہوں گی، جنہیں میں اپنی دانست میں بھول چکا ہوں..... لیکن وہ لاشعور میں محفوظ ہوں گی۔ کیا پتا..... میری بیوی نے مجھے باندھ کے بارے میں کبھی بتایا ہو اور میں شعوری طور پر بھول گیا ہوں۔ میں بھلا کیسے یقین کر لوں کہ مرے ہوئے لوگوں سے رابطہ ممکن ہے؟“

”ان سوالوں کے جواب تو خود سے پوچھو ننھے۔“

”تم بتاؤ پرتاپ! روحوں کی مملکت کے بارے میں بتاؤ مجھے۔ یہ بتاؤ، تم لوگ کپڑے کیسے پہنتے ہو؟ تم لوگ کیسے لگتے ہو جسمانی طور پر کون سی عمر ملی ہے تمہیں؟“

”ہماری دنیا میں یہ سب کچھ ہماری مرضی پر منحصر ہے۔“ پرتاپ نے کہا۔

”تم مجھے یہ توقف بنا رہے ہو پرتاپ لیکن میں تمہیں ایک موقع اور دوں گا۔ یہ بتاؤ موت کے بعد زندگی کیسی لگتی ہے؟“

”ننھے..... ہم پورا نقشہ بیان نہیں کر سکتے۔ یہ ناممکن ہے۔ سنو ننھے.....“

تمہاری ماں بھی موجود ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“ ہیری کے ہونٹ لرزے..... پھر وہ دوبارہ بولا۔ ”وہ کہہ رہی ہے، اسے تمہارے باپ سکندر کے بارے میں یہ جان کر دکھ ہوا کہ وہ اب پاگل خانے میں ہے۔“

”میرا باپ پاگل خانے میں..... اسی شرم میں؟“ فاروق نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔ یہ بات عجیب تھی کیونکہ وہ اپنے باپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اگر یہ سچ ثابت ہوا تو یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ مرنے والوں سے رابطہ ممکن ہے..... روحوں کا وجود بھی ثابت ہو جائے گا اور عالم ارواح بھی.....

”اب مجھے جانا ہے ننھے۔“

ہڑی۔ اسے زبردست شاک لگا۔ ۴۴ نمبر بیڈ پر لیٹا ہوا شخص ہو ہوا اس جیسا تھا۔ فاروق کو یقین تھا کہ بڑھاپے میں وہ بھی اس شخص جیسا ہی ہوگا۔ وہ یقیناً اس کا باپ تھا۔

”سکندر صاحب!“ فاروق نے اسے پکارا۔

اس شخص نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

”آپ جانتے ہیں کہ آپ کون ہیں؟ ناہید نامی لڑکی یاد ہے آپ کو؟“ فاروق نے پوچھا۔ وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ”آپ کو یاد ہے؟“

”ہاں مجھے آفا حشر کے ڈرامے یاد ہیں۔“ سکندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
فاروق نے اس کے کندھے تھام کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ”آپ کو ناہید یاد ہوگی۔ آپ نے بعد میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔“
”آنکھ کا نشہ۔“ اس نے جج کر کہا۔

فاروق نے سر جھٹکا۔ اسے اجناس ہو رہا تھا کہ بات کرنا بے سود ہے۔ اس بدکار شخص کو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اصرار کیا۔ ”یاد کرنے کی کوشش کیجئے۔“
”باپ کا گناہ۔“

”مسٹر فاروق..... انھیں زیادہ ڈسٹرب نہ کریں۔“ ڈاکٹر نے جانے کب اس کے برابر آکھڑا ہوا تھا۔

فاروق پلٹا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ وہ شخص یقینی طور پر اس کا باپ تھا۔ اب اسے یقین آگیا تھا کہ اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیا بھی ہے اور اس سے رابطہ بھی ممکن ہے۔ اب اسے اپنے سفر کی بے تابی تھی۔

☆=====☆=====☆

ماہر اور سادھنا لیبارٹری میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ماہر پڑمرہ دکھائی دے رہا تھا۔ جبکہ سادھنا کچھ فکر مند تھی۔ فاروق نے اندر آتے ہی کہا۔ ”ایسی کون سی اہم بات تھی جو فون پر مجھے نہیں بتائی جاسکتی تھی؟“

ماہر نے منہ بنا کر کہا۔ ”سب کچھ ختم سمجھو۔ ایڈوائزری بورڈ نے تجربے کی منظوری دینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کو خطرے میں ڈلنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ہم ان کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ سادھنا نے خوش ہو کر کہا۔ ”فاروق شہرت کے حصول کے لیے اور کوئی کام کر سکتا ہے۔“

”آج شاید میرا دن ہی نہیں ہے۔“ فاروق نے کہا اور انھیں ہیری کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ ماہر تلخی سے مسکراتا رہا۔ فاروق نے اپنے لیے پیالی میں کافی انڈیلی اور بولا۔ ”منصوبہ تو ڈاکٹر پال نے بنایا تھا۔ انھیں معلوم ہوگا کہ ایڈوائزری بورڈ اس تجربے کی مخالفت کرے گا۔ اس کے باوجود وہ اس سے دست بردار نہیں ہوئے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے رسک پر یہ تجربہ کرتے..... اور ضرور کرتے۔“

سادھنا نے ماہر کی آنکھوں میں چمک ابھرتے دیکھی۔ تو پُر تشویش لہجے میں بولی۔ ”فاروق..... تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟ یہ رسک کوئی بھی نہیں لے سکتا۔ بلیک لسٹ کر دیا جائے گا۔ اگر تجربے میں کوئی انسانی جان ضائع ہوگی تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تجربہ کرنے والوں کو کن نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔“

”تجربہ راز داری کے ساتھ بھی تو کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔“ فاروق نے کہا۔ ”ڈاکٹر پال کے ذہن میں بھی یہی بات ہوگی۔“
ڈاکٹر ماہر نے اثبات میں سر ہلایا لیکن سادھنا نے احتجاج کیا۔ ”تم غلط کہہ رہے ہو۔“

فاروق نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ماہر سے کہا۔ ”ڈاکٹر..... آپ کا کیا خیال ہے؟ جرأت کے بغیر نہ کوئی تجربہ ممکن ہے اور نہ سائنس کے میدان میں پیش قدمی کیا کتے ہیں آپ؟“

ماہر نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلادیا۔ ”ہاں..... یہ ممکن ہے۔ میں اپنے اسٹاف سے جھوٹ بول سکتا ہوں کہ بورڈ نے تجربے کی منظوری دے دی ہے۔ ہم دوسری دنیا میں تمہاری رہنمائی کے سلسلے میں ہیری سے مدد لے سکتے ہیں۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ مجھے تجربے کی کامیابی پر پورا یقین ہے۔“

☆=====☆=====☆

فاروق ڈیوٹہ چیمبر میں بستر پر لیٹا تھا۔ بستر کے قریب ایک کرسی پر ہیری بیٹھا تھا۔ وہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے اشارے کا منتظر تھا۔ فاروق کا جسم پسینے میں نہلایا ہوا تھا۔ فاروق اور ہیری ایک دوسرے کو نفرت سے دیکھ رہے تھے۔ سادھنا نے انھیں سمجھایا اور ہاتھ

ملانے کی درخواست کی لیکن دونوں نے ہی انکار کر دیا۔ فاروق کے نزدیک ہیری ناقابل اعتبار تھا۔ بلکہ ممکن تھا کہ بلیئر اور ڈاکٹر پال کو اسی نے قتل کیا ہو۔

فاروق کا ذہن اس وقت شکوک کا شکار ہو رہا تھا۔ کوئی بھی اسے قتل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا تاکہ عالم ارواح کا راز راز رہ سکے۔ جو نیکینش اس وقت اس کے ساتھ مصروف تھے، وہ ایک غلط فہم دبا کر اسے موت سے ہمکنار کر سکتے تھے۔ روہیں بھی ایسا کر سکتی تھیں۔

پھر اس نے سر جھٹکا۔ اب اس کے نزدیک کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بے کار شک میں مبتلا ہونے سے فائدہ؟

اسی لمحے کسی نے اس کے رخسار کو چھوا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ سادھنا تھی۔ ”کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ سادھنا نے پوچھا۔

”مجھے لگ رہا ہے کہ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔“
”تم بالکل نہ ڈرو۔ میری نظریں گھڑی پر جمی رہیں گی، میں کوئی گزربز نہیں ہونے دوں گی۔“

”میں دماغ کو نقصان پہنچنے سے نہیں ڈر رہا ہوں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ ممکن ہے، میری روح وہاں زیادہ دیر رکی رہے۔ اس صورت میں میرا جسم بے روح رہ جائے گا۔“

سادھنا نے اسے تسلی دینے کے لیے اس کا ہاتھ تھام لیا اور سہلانے لگی۔
اچانک ڈاکٹر ماتھر آیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ اس نے اپنا لیب کوٹ اتار کر ایک طرف اچھال دیا۔ ”اٹھو فاروق کپڑے پہن لو۔ اس بار کھیل سچ سچ ختم سمجھو۔“
”کیوں..... کیا ہوا؟“ سادھنا نے پوچھا۔

”بورڈ کے ممبرز کو کہیں سے بھٹک مل گئی ہے۔ وہ معائنہ کے لیے آرہے ہیں۔ کسی اسی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں.....“

”انھیں یہاں تک پہنچنے میں چار منٹ تو لگیں گے ہی۔“ فاروق نے لیٹے لیٹے کہا۔
ایک منٹ میں مجھے سفر پر روانہ کر سکتے ہو..... اور تین منٹ میں میں واپس بھی آجاؤں گا۔ جلدی کرو۔ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔“

ڈاکٹر ماتھر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے سادھنا سے کہا۔ ”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

اب جلدی کرو۔“

☆=====☆=====☆

ایک نیکینش نے فاروق کو آپریٹنگ ٹیبل پر باندھ دیا۔ سادھنا نے اس کی پیشانی سے پینہ پونچھا۔ ”تمہیں دوسری دنیا میں کسی کو پیغام پہنچانا ہے تو بتا دو۔“ فاروق نے چمک کر کہا۔ ”پتا ہے، میں زرینہ کو بتاؤں گا کہ میں اس سے ملنے کے لیے مارجا رہا تھا۔ سمجھیں؟“

سادھنا اس کی خوش مزاجی اور بیجان پر مسکرا دی۔ مگر اس کی ایک آنکھ میں پانی سا آگیا۔ اس نے سر جھٹک کر فاروق کا ہاتھ سہلایا اور دور ہٹ گئی۔ سامنے بیٹھا ہوا ہیری ٹرانس میں جا چکا تھا۔ ڈاکٹر ماتھر نے فاروق کے بازو میں انجکشن لگایا اور بولا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ابدیت کی ایک جھٹک دیکھنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔“
ایک لمحے کو فاروق کا جی چاہا کہ چیخ کر منع کر دے۔ کیا پتا..... ابدیت بھیگی بھیگی تاریکی میں بے خواب نیند کے سوا کچھ ثابت نہ ہو، جس سے واپس آنا بھی اس کے اختیار میں نہ ہو۔ وہ اپنی زندگی کا خطرہ کیوں مول لے۔ مگر اتنی دیر میں دوا کا اثر شروع ہو چکا تھا۔ وہ لایعنی الفاظ بڑبڑاتا رہا۔ پھر اسے نیند آگئی..... آوازیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دائرے لہرا رہے تھے۔

وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ لبو سے محروم ایک سوکھا ہاتھ تھا، جس میں ایک خنجر تھا اور وہ امید سے محروم تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ پھر اسے ایک خوف ناک جھٹکا لگا۔ ایسا لگا جیسے اس کے جسم کا ہر ماسم، ہر خلیہ، تمام عضلات کھل رہے ہوں۔ پھر اس کا دل بند ہو گیا۔ زندگی معدوم ہو گئی۔

☆=====☆=====☆

”اب چارج کر دو۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔

نیکینش نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ اس سیاہ باکس کو بیڈ کے قریب گھسیٹ لایا، جس پر دو الیکٹروڈ بیڈل رکھے تھے۔ ان کے ساتھ گول پلیٹس منسلک تھیں۔ ایک بیڈل فاروق کے سینے پر اور دوسرا کمر کے نیچے رکھ دیا گیا۔ نیکینش نے ڈاکٹر کے اشارے پر سوئچ آن کیا۔ چار سو واٹ کے شاہک نے بندھے ہوئے جسم کو بھی تشخیز میں مبتلا کر دیا۔ لمحے گزرنے، دل بدستور دھڑکتا رہا لیکن وہ خون پمپ نہیں کر رہا تھا۔ ماتھر نے اسکیئر پر نگاہ

ڈالی۔ اب سیاہ اسکرین پر متحرک سفید نقطے نظر نہیں آرہے تھے۔

ماہر نے سر ہلایا اور اگلے قدموں چیمبر سے نکلا، جیسے کسی شہنشاہ کے دربار سے رخصت ہو رہا ہو۔ اب وہ چار منٹ والے سرجیکل کلاک کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کوئی خطرہ مول نہ لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کاؤنٹر شاک کو ۷۵ سیکنڈ پر سیٹ کر دیا۔ پھر اس نے ای ای جی کا جائزہ لیا۔ بکھرا ہوا پیٹرن اب خط مستقیم کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ کلینیکل اعتبار سے فاروق بلال مرچکا تھا۔

☆=====☆=====☆

اس کی نگاہوں کے سامنے ہولے نمودار ہوئے اس نے اپنی ماں کو دیکھا، جو جنرل اسٹور کے دروازے پر کھڑی تھی۔ پھر اس نے ماں کا کمر اور اپنے کھلونے دیکھے۔ اسے یتیم خانے میں گزرا ہوا عرصہ نظر آیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بیدار ہو رہا ہے۔ اب وہ سوچ بھی سکتا تھا۔

روح؟ کیا روح محض ایک ٹیپ ریکارڈر ہے، جس پر آدمی کی زندگی کا پیٹرن ریکارڈ ہوتا ہے؟ وہ دوبارہ زندگی گزار رہا تھا۔ ایسا ایک بار پہلے بھی ہو چکا تھا، جب پکنک کے دوران پانی کی ایک تندہ لہر اس کے وجود پر سے گزر گئی تھی اور ہیمپھمزوں میں پانی بھر گیا تھا۔ تب اس نے اپنے ماضی کو دہرایا تھا۔ اب پھر اس کی آنکھوں کے سامنے فلم سی چل رہی تھی۔ ایک فرق تھا۔ اس بار وہ جو کچھ کر سکتا تھا اور نہیں کر سکتا تھا، اس پر بچھتا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے دوبارہ زندگی گزارنے کا موقع ملے تاکہ اس بار وہ درست فیصلہ کر سکے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم بھاری ہو گیا ہے۔ ایک عجیب سی اینٹھن نے اسے جکڑ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے اس کا خوابیدہ جسم پٹرولیم جیلی کے تالاب سے نکل رہا ہے۔ جسم بوجھل ہو رہا تھا مگر جیسے ہی اس نے خود کو اینٹھن کی گرفت سے چھڑایا، اسے آزادی کے خوش کن احساس نے بھگو ڈالا۔ اب وہ غبارے کی طرح فضا میں تیر رہا تھا۔ نیچے اسے حقیقی دنیا نظر آرہی تھی۔ نیبل تھی جس پر اس کا جسم بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے اور چہرہ بے رنگ ہو رہا تھا۔ روشنی کی لکیروں کا ایک ہیولا اسے پکار رہا تھا۔..... ”آؤ، ادھر آؤ۔“

وہ پر تاپ کی آواز پہچان گیا۔ پھر وہ تیرتا ہوا پر تاپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ دونوں

ڈیٹھ چیمبر کی ٹھوس دیواروں میں سے بہ آسانی گزر گئے۔ نکلنے سے پہلے اس نے سادھنا اور ماتھر کو باتیں کرتے دیکھا۔ ”تم روح کو قید نہیں کر سکتے۔“ اس نے چیخ کر کہا۔ ”ہم ہر چیز سے گزر سکتے ہیں۔“ لیکن انھوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ اپنی باتوں میں لگے رہے۔ وہ پھر چیخا..... اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا لیکن وہ اسے نہ دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے۔

اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے خود کو یاد دلایا کہ اسے خود پر قابو رکھنا ہے اور جو کچھ دیکھے اور سنے، اسے یاد رکھنا ہے.....

آسمان صاف تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی بے شمار آنکھیں ہیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس میں اپنے آپ کو ناقابل یقین تیزی سے زمین اور آسمان کی کسی بھی چیز میں تبدیل کر لینے کی اہلیت ہے۔ نیچے جانا بچپنا شہر بھی اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔ اس کی یادداشت غضب کی ہو گئی تھی۔

”یہ موت ہے، اس نے سوچا۔ نہیں..... یہ زندگی ہے..... اتنی آزادی کا احساس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ زندگی ہے، اس کے خیالات سے پُر ذہن میں ایک پیغام داخل ہوا۔ فاروق..... مجھے افسوس ہے کہ میں روح کی جستجو پر زور دیتا رہا۔ اب میں ہر قیامت پر ان تجربات کو روکنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے تمہیں ختم کرنا ضروری سمجھا۔ اب میں تم سے التجا کر رہا ہوں..... واپس جا کر انھیں یہ نہ بتانا کہ موت ایک روشن زندگی کا آغاز ہے۔ انھیں پہلے آزمائشی زندگی گزارنا ہوگی، تب کہیں ابد کا ٹکٹ ملے گا۔“ وہ پیٹریجن کی آواز تھی۔ پھر ایک اور آواز آئی اور اس نے سات رنگوں کا وجود اوڑھ لیا۔ وہ زریں تھی۔

☆=====☆=====☆

سادھنا نے کلاک کو دیکھا۔ ۱۲۵ سیکنڈ گزر چکے تھے۔ ”خدا کے لیے..... اسے شک دے کر واپس لاؤ۔“ اس نے سخت لہجے میں سرگوشی کی۔

”نہیں..... چند سیکنڈ اور۔“

”نہیں ماتھر، اسے فوراً واپس لاؤ۔“ اس بار وہ چلا اٹھی۔ ماتھر ہچکچایا۔ پھر اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور نیکینش کو اشارہ کیا۔

”جلدی کرو۔“ سادھنا نے نیکینش کو حکم دیا۔

فاروق بلال دوبارہ مچکا تھا۔ اس کے باوجود نیکینش نے آواز تنفس اس کے منہ سے لگایا اور اس کے سائت مچھڑوں میں آکسیجن اتارنے لگا۔ ای کے جی لائن اب بھی نارمل نہیں تھی اور ای ای جی لائن بالکل فلیٹ تھی۔ ماتھر نے جلدی سے اس کے بے جان بازو میں دوا انجکٹ کی اور دو قدم پیچھے ہٹ آیا۔

دھیرے دھیرے زندگی کی علامات لوٹ آئیں۔ آپریٹنگ روم میں فون کی گھنٹی بجی۔ استقبالی کلرک نے بتایا کہ ایڈوائزری بورڈ کے اراکین لفٹ میں بیٹھ رہے ہیں۔

☆=====☆=====☆

دھنک رنگ پالے کے باوجود اس نے زرینہ کو بہ آسانی پہچان لیا۔ زرینہ کی آواز اور لہجے میں مسرت تھی۔ ”آؤ فاروق..... تمہیں تمکین سے ملوؤں۔“

فاروق دھیرے دھیرے زرینہ کی طرف بڑھا مگر پھر اچانک جیسے کسی انجانی قوت نے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ ایک تاریک سرگ کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے اس بے اختیار سفر کو موقوف کرنے کے لیے زور لگایا مگر بے سود۔ تاریکی اسے کھینچ رہی تھی۔ ساتھ ہی اذیت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

پھر اسے سادھنا، ڈاکٹر ماتھر اور لیبارٹری کا دوسرا شاف نظر آیا۔ ہیری سینے سے ٹھوڑی ٹکائے سوگوار سا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے اپنے بے روح جسم کو نیبل پر بکھرا دیکھا۔ ”مجھے واپس جانے دو۔“ وہ چلایا۔ مگر تاریکی اسے اپنی طرف کھینچتی رہی۔ سمندر کی برہم موجوں کے اوپر ریت کا تند گولا چل رہا تھا۔ ہوا، پانی اور ریت کو ملا رہی تھی۔ ہر طرف کچڑا چھلتی نظر آرہی تھی۔ پھر طوفان ختم ہوا اور سوج نکل آیا۔ ہر چیز چننے ترننے لگی۔ کچڑ چٹان میں تبدیل ہو گئی۔

اسے ایسا لگا۔ جیسے وہ سخت اور گرم ریت میں دھنسا جا رہا ہو.....

☆=====☆=====☆

”یہ زندہ ہو گئے۔“ ایک نیکینش نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ ”اب ان کا دل خود دھڑک رہا ہے..... بغیر کسی بیرونی مدد کے۔“

ڈاکٹر ماتھر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ اس کے دماغ کو کسی نہ کسی حد تک نقصان پہنچ چکا ہے۔ یہ ہمیں اس دنیا کی کہانی کبھی نہیں سنا سکے گا۔“

سادھنا رو رہی تھی۔ ”اسے پاگل خانے میں زندہ رہنے کے لیے واپس بلایا ہے تم

الیکٹروڈ فاروق کے سینے پر اور پیٹھ کے نیچے رکھ دیئے گئے۔ سوچ آن کیا گیا۔ مگر جھنہاٹ کی آواز نہیں ابھری۔ مشین بہت آہستگی سے روتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بیٹھ چیمبر میں تاریکی چھا گئی۔ روشنی کا نام بھی نہیں رہا۔

”ہے بھگوان..... یہ شارٹ سرکٹ ہو گیا۔“ نیکینش نے چیخ کر کہا۔ وہ ایک گوشے کی طرف لپکا اور اس نے جزیئر کالیور کھینچا۔ روشنی ہو گئی۔ مشین کی جھنہاٹ بے حد واضح تھی۔ عملہ ای ای جی اور ای کے جی کی سیدھی لائنوں کو دیکھتا رہا۔ وہ منتظر تھے کہ دل اپنے نارمل ردھم پر دھڑکنا شروع کر دے۔

اب فاروق کو زندگی سے محروم ہوئے چار منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ دس سیکنڈ اور گزر گئے۔ اس کا دل بدستور معطل رہا۔

”نبضوں کی رفتار اب بھی صفر ہے۔“ نیکینش نے کہا۔

”مجھے بھی نظر آرہا ہے۔“ ڈاکٹر ماتھر غرایا۔

پھر ای کے جی اسکرین پر کمزور سے نقطے ابھرے۔ اسٹاف نے سکون کی سانس لی۔

ای ای جی پر بھی نقطے متحرک ہو گئے تھے۔

”رفتار بہت کم ہے۔“ سادھنا نے کہا۔ ”اس کا دماغ..... ہے بھگوان..... اب وہ محض گوشت کا ڈھیر رہے گا۔ اس کا دماغ.....“

”میں اس کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ ماتھر نے سخت لہجے میں کہا۔

عملہ ای ای جی اسکرین کی طرف متوجہ تھا جس پر دل کی شدید جدوجہد نقطوں کی شکل میں نظر آرہی تھی۔ پھر نقطے دھیرے دھیرے اوپر چڑھتے نظر آئے یہ دل کے طاقت پکڑنے کی علامت تھی مگر رفتار ابھی تسلی بخش نہیں تھی۔

نیکینش پریشر ریڈنگ بتا رہا تھا۔ ”بچپن..... ساٹھ..... پینٹھ.....“

”خطرے کی حد سے بہ مشکل اوپر ہے۔“ ماتھر نے سادھنا سے کہا۔ پھر اس نے پکارا۔ ”آکسیجن دو۔“

نیکینش پریشر ریڈنگ دہراتا رہا پینتیس..... اور مسلسل گر رہا ہے پریشر۔“

ماتھر دروازے کی طرف لپکا۔ ”آؤ تنفس کہاں ہے؟“

ای کے جی اسکرین پر اب دو نقطے نظر آرہے تھے۔ کمرے کی فضا بے حد کشیدہ تھی۔ ریڈنگ پڑھنے والے نیکینش نے کہا۔ ”اب ریڈنگ ہے ہی نہیں۔“

نے۔ بھگوان کے لیے..... اسے مرجانے دو۔ یہ تو کوئی زندگی نہیں۔“
 ”نہیں جو المیہ ہو چکا ہے، وہی بہت ہے۔ ہم ارتکابِ قتل نہیں کر سکتے۔“ ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔

اسی لمحے ہیری ایک جھٹکے سے ٹرانس سے باہر آیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ فاروق صاحب دوسری دنیا دیکھ آئے ہوں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 وہ بیدار ہوا تو اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور کنپٹیاں ترخ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ دل پسلیوں کا پنجر توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور خالی خالی نظروں سے ارد گرد کھڑے لوگوں کو دیکھا، جو سفید کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک اجنبی، نسوانی چہرہ اس پر جھک آیا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر کمرے میں کچھ اور لوگ داخل ہوئے، وہ سب بھی اس کے گرد کھڑے ہو گئے۔

اس نے اپنا منہ پھیرا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس مہکتی ہوئی حرارت اور چمک دار سکون کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا اسے چند لمحے پہلے تجربہ ہوا تھا۔ اسے اور کسی چیز کا خیال نہیں تھا اسے کسی بات کی بھی پروا نہیں تھی۔

☆=====☆=====☆

وہ منہ پھیرے لیٹا تھا۔ کھڑکی سے دھوپ اتر آئی تھی، دیوار پر پر چھائیاں تھیں لیکن اسے کسی چیز کی..... بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا۔ دروازہ کھلا اور اسے اپنی داہنی سمت حرکت کا احساس ہوا لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔
 وہ اجنبی، نسوانی چہرہ ایک بار پھر اس پر جھکا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ جو اس نے اس کے بازو میں اتار دی۔ سوئی چھپنے سے اسے تکلیف محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا بازو جھٹکے سے ہٹایا۔

وہ عورت سسکتے ہوئے، محبت بھرے لہجے میں اس سے کہہ رہی تھی۔ ”فاروق..... میرے فاروق..... ذرا سی تکلیف تو ہوگی۔ مگر یہ دوا تمہیں واپس لے جائے گی۔ جاؤ میری جان، وہ لوگ تمہارے منتظر ہیں۔ شب بخیر میری جان..... میری زندگی..... الوداع.....“

☆=====☆=====☆ ختم شد =====☆